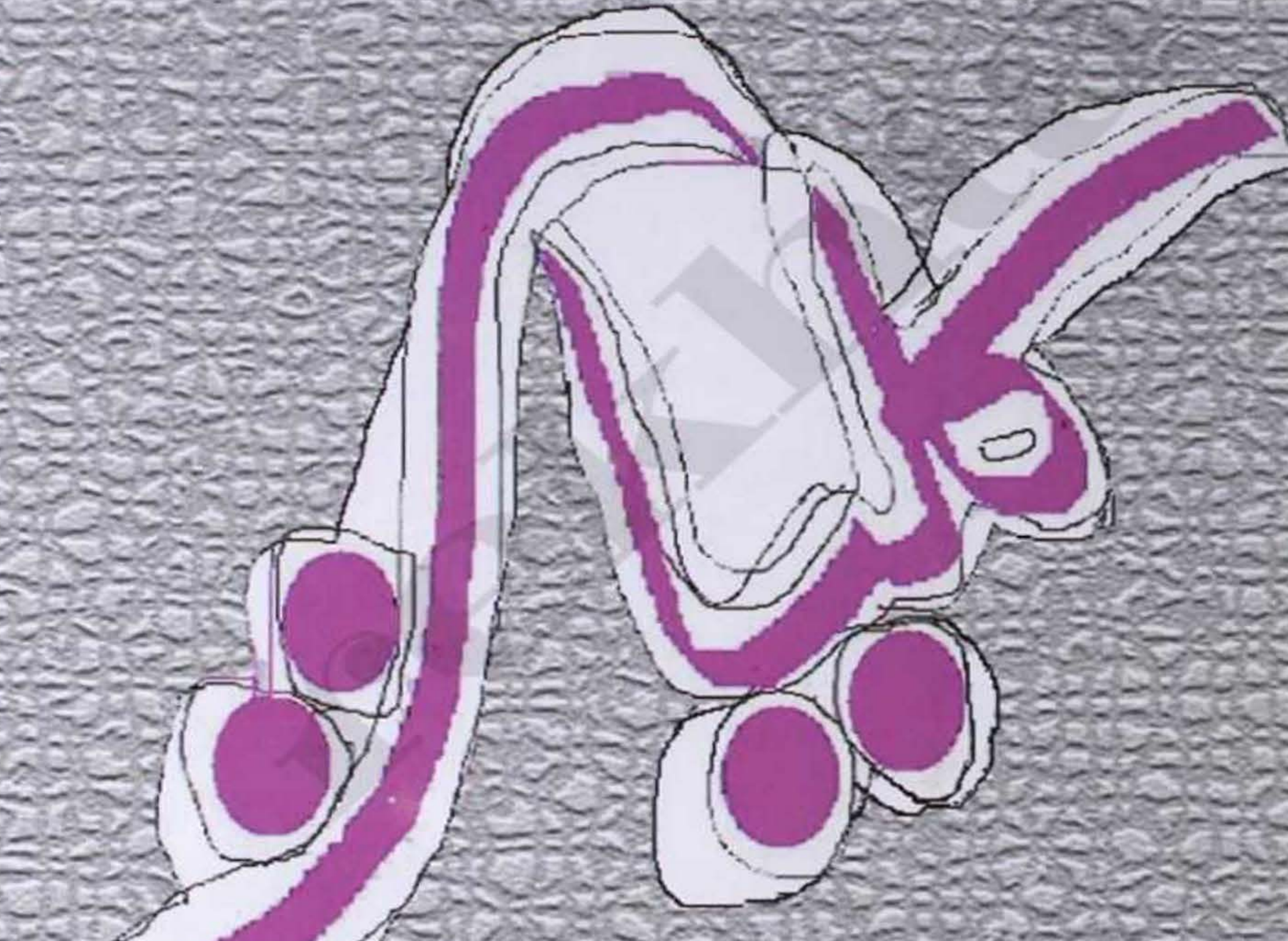

احمد مشتاق

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 - 307 - 7002092

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کتب مرلز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک با آسانی رسائی کیلئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ با آسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ اور ہ کتابوں کے نام سے معاوضہ وصول کرنے والوں سے ہمارا قطعہ کسی بھی کسی کا نا کوئی تعلق نا واسطہ ہے ہمارا مقصد اردو ادب کا فروغ اور رضائے الہی کیلئے دوسروں کی مدد ہے اور واٹس ایپ پر خواتین کیلئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے برائے مہربانی جو خواتین الگ برائے خواتین گروپ میں شمولیت اختیار کرنا چاہیے تو گروپ ایڈمنز سے رابطہ کریں۔

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک :
HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBIJHJMKBQBNKUPZFE5Z
HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

احمد مشتاق

کلیات

۱۹۵۲ تا ۲۰۰۳

شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

rekhta

باراول، لاہور، ۱۹۹۲

باردوم (مع تصحیح واضافہ) الہ آباد، مارچ، ۲۰۰۴

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ناشر : شب خون کتاب گھر، ۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

فون نمبر : 91-532-2622693

سرورق : عادل منصوری

کمپوزنگ : ریاض کمپیوٹرز، الہ آباد

طابع : بھارگو آفسٹ، الہ آباد

باہتمام : امین اختر، شاداب مسیح الزماں، ریاض احمد، خواجہ جاوید اختر

قیمت : دو سو پچاس روپے

ں
851
A25KA

۱ مجموعہ ۱۵

۲ گردِ مہتاب ۱۱۵

۳ کلیات: طباعت اول ۱۹۷

۴ نیا کلام ۲۰۷

کلیات احمد مشتاق

۱۹۵۲ تا ۲۰۰۳

فہرست

مجموعہ

۱	ترے دیوانے ہر رنگ رہے ترے دھیان کی جوت جگائے ہوئے	۲۳
۲	تو آپ سے آپ آ گیا تھا	۲۴
۳	شفق میں رنگ ہیں بیتے ہوئے زمانے کے	۲۶
۴	گم ہے انھیں گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا	۲۷
۵	چاند بھی نکلا ستارے بھی برابر نکلے	۲۸
۶	چھٹ گیا ابر شفق کھل گئی تارے نکلے	۲۹
۷	رنگ کیا کیا نہ دکھانے آئے	۳۰
۸	چھوڑ آتی ہے کہاں ان کو ستم گر چاندنی	۳۲
۹	یہ تنہا رات یہ گہری فضائیں	۳۳
۱۰	کہاں ڈھونڈھیں اسے کیسے بلائیں	۳۴
۱۱	بہتا آنسو ایک جھلک میں کتنے روپ دکھائے گا	۳۵
۱۲	منھ دیکھے کی ساری باتیں روٹھو گے کہ مناؤ گے	۳۶
۱۳	کس کی تلاش میں چلے عشق کے خانماں خراب	۳۷
۱۴	دور خزاں کی صبح سے بھید ملے بہار کے	۳۹
۱۵	منظر صبح دکھانے اسے لایا نہ گیا	۴۱
۱۶	کل یہی رات تھی، نیند آئی تھی حسب معمول... ہجراں بن کر	۴۲
۱۷	آنکھیں تو نہ مانیں گی آنکھوں کو تو بہنا ہے	۴۳
۱۸	ترانۂ غم دل قصۂ شب محزوں	۴۴
۱۹	روشنی گو مرے سخن میں نہیں	۴۵
۲۰	آنکھ اٹھاتا ہوں تو ہٹ جاتے ہیں	۴۶

rekhta

۲۱	جلتے جلتے بنے پتنگے... بے اختیار شمعیں	۴۸
۲۲	مرے خوابوں میں کب زلفوں کو بکھرا کر نہیں آیا	۵۰
۲۳	چاند اس گھر کے دریچوں کے برابر آیا	۵۱
۲۴	ٹوٹتا ہے کلی کلی کا خمار	۵۲
۲۵	سن اے ہر قدم پر ٹھہر جانے والے	۵۳
۲۶	شاخ سے دور شاخسار سے دور	۵۴
۲۷	اداس کر کے دریچے نئے مکانوں کے	۵۵
۲۸	کوئی اپنی دھن میں گذر جائے گا	۵۶
۲۹	بھٹک نہ جائیں کہیں رہروان راہ وفا	۵۷
۳۰	پوچھتے ہیں کہ مری بے خبری کیسی ہے	۵۹
۳۱	کہوں کس سے رات کا ماجرا نئے منظروں پہ نگاہ تھی	۶۱
۳۲	ابھی جن کے دم قدم سے مرے رت جگے ہیں روشن... طلعتیں پرانی	۶۲
۳۳	میں وہ نہیں جو کلبۂ احزاں میں بند ہے... محفل گھرا ہوا	۶۴
۳۴	چھائی ہوئی ہے غم کی گھٹا کائنات پر	۶۵
۳۵	تاروں سے پرے نکلنے والے... چلا چلی ہے	۶۶
۳۶	لے کے ہمراہ چھلکتے ہوئے پیمانے کو	۶۷
۳۷	مسلسل یاد آتی ہے چمک چشم غزالاں کی	۶۸
۳۸	کہو کیسے اب سناؤں تمھیں نغمۂ جدائی	۷۰
۳۹	دل اندر سے کچھ کہتا تھا	۷۱
۴۰	آخر تمام داغ مٹے زخم بھر گئے	۷۲
۴۱	اک پھول میرے پاس تھا اک شمع میرے ساتھ تھی	۷۴
۴۲	یک جہتی جنوں سے گریزاں ہے آج بھی	۷۵
۴۳	دھیمی ہے مسافروں کی رفتار	۷۶
۴۴	تنہائیوں میں نغمہ سرا ہو گیا کوئی	۷۸
۴۵	آنکھیں بھی کھلی ہیں اس ہوا میں... بلے ہیں	۷۹
۴۶	نہ باقی رہا کچھ نشان بہار... اڑا لے گئی	۸۰
۴۷	تقدیس سحر تھی کہ نوائے دل شب تھی	۸۱
۴۸	نت نئے منظر دکھاتا ہے ان آنکھوں کا بناؤ	۸۲
۴۹	گردش شام و سحر دن کوئی ایسا نکلے	۸۴
۵۰	زلف دیکھی وہ دھواں دھار، وہ چہرہ دیکھا؟	۸۵
۵۱	نکلے تھے کسی مکان سے ہم	۸۶

۵۲	کیا صبا ڈھونڈھتی پھرتی ہے پریشاں، خالی	۸۷
۵۳	ساتھ شبنم کے رو گئے ہم بھی	۸۸
۵۴	ادا و ناز کو انداز دلبرانہ سمجھ	۸۹
۵۵	میں لہو کی بوند مژگاں پر لئے پھرتا رہا	۹۰
۵۶	دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے	۹۱
۵۷	اب کے اس باغ میں وہ رنگ خزاں دیکھوگے	۹۲
۵۸	ہر لحہ ظلمتوں کی خدائی کا وقت ہے	۹۳
۵۹	خواب کے پھولوں کی تعبیریں کہانی ہوگئیں	۹۴
۶۰	دل میں شور برابر ہے	۹۵
۶۱	تم آئے ہو تمھیں بھی آزما کر دیکھ لیتا ہوں	۹۷
۶۲	ہاتھ سے ناپتا ہوں درد کی گہرائی کو	۹۹
۶۳	وہ چلتی تو خیال وصل اس کے ساتھ چلتا تھا	۱۰۰
۶۴	ورق الٹ رہا ہوں مدتوں پرانی بات کے	۱۰۱
۶۵	نہیں کہ صبح تلک اس کی راہ تکتے رہو	۱۰۲
۶۶	حیران ہوں سحر کے نظارے کو دیکھ کر	۱۰۳
۶۷	خبر نہیں تری آنکھوں کے اس طرف کیا ہے..نظر نہیں آتے	۱۰۴
۶۸	میں تجھے بھول نہ جاتا تو خزاں ہی رہتی...دلانے آیا	۱۰۵
۶۹	روئے تھے ہم پچھلے ساون میں	۱۰۶
۷۰	کیسے اس ہجر کی بستی میں گذارہ ہوگا...ہوا اچھی ہے	۱۰۷
۷۱	یہ مٹی جس پہ سورج ناچتا ہے... چھانتے ہیں	۱۰۸
	اشعار	۱۰۹

گردِ مہتاب

	پیش لفظ — انتظار حسین	۱۲۱
۷۲	یہ ہم غزل میں جو حرف و بیاں بناتے ہیں	۱۳۱
۷۳	خون دل سے کشت غم کو سینچتا رہتا ہوں میں	۱۳۳
۷۴	اب نہ بہل سکے گا دل اب نہ دیئے جلایئے	۱۳۴
۷۵	میٹھی نیند میں آئیں گے سپنے نئے جہان کے	۱۳۵
۷۶	خیر اوروں نے بھی چاہا تو ہے تجھ سا ہونا	۱۳۶
۷۷	دنیا میں سراغ رہ دنیا نہیں ملتا	۱۳۷
۷۸	میں نے اپنے آپ سے دھوکا کیا	۱۳۸

۷۹	یہ نقشِ محبت ہے دوبارہ نہ بنے گا	۱۴۰
۸۰	کیوں چھوڑ گیا مجھے ترستا	۱۴۱
۸۱	بظاہر تو بچھڑتے جا رہے ہیں	۱۴۳
۸۲	زلفیں پکارتی ہیں پریشاں کہاں گئے	۱۴۴
۸۳	تم ملے بھی تو ملاقات نہ ہونے پائی	۱۴۵
۸۴	ہوا سکوں بھی میسر تو اضطراب رہا	۱۴۶
۸۵	شعبدے سب زبان کے دیکھے	۱۴۷
۸۶	عشق میں کون بتا سکتا ہے	۱۴۹
۸۷	بہت رک رک کے چلتی ہے ہوا خالی مکانوں میں	۱۵۱
۸۸	افسردگی شوق کی فرصت ہے ابھی تک	۱۵۲
۸۹	تیری نظروں نے یہ بات اب مجھے سمجھائی ہے	۱۵۳
۹۰	دل کو یادِ شامِ ہجر پھر اداس کر گئی	۱۵۴
۹۱	ہے بے توجہی میں نہاں اس کا دیکھنا	۱۵۵
۹۲	کیسے انھیں بھلاؤں محبت جنھوں نے کی	۱۵۶
۹۳	ترا وجود ہی سب سے بڑی حقیقت ہے	۱۵۷
۹۴	جانا ہے جب سے دل کو ہے دھڑکا لگا ہوا	۱۵۸
۹۵	کیسے ہر آن بدل جاتا ہے منظر دیکھو	۱۵۹
۹۶	روشنی رہتی تھی دل میں، زخم جب تک تازہ تھا	۱۶۰
۹۷	رخصتِ شب کا سماں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا	۱۶۱
۹۸	کیا خبر راستے میں رہ جاؤں	۱۶۲
۹۹	وہ جس کی آرزو میرے دلِ تنہا میں رہتی ہے	۱۶۳
۱۰۰	جس نے ایجاد کیا روح کی سرشاری کو... ہنر اس کا ہے	۱۶۴
۱۰۱	چاندنی رات تھی اک پھول تھا اک سایہ تھا... اُکلا سایہ	۱۶۵
۱۰۲	مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے	۱۶۶
۱۰۳	ہمیں سب اہلِ ہوس ناپسند رکھتے ہیں	۱۶۷
۱۰۴	کہیں امید سی ہے دل کے نہاں خانے میں	۱۶۸
۱۰۵	یہ کہنا تو نہیں کافی کہ بس پیارے لگے ہم کو	۱۶۹
۱۰۶	چپکے چپکے گھر میں بیٹھے عاشقی کرتے رہے	۱۷۰
۱۰۷	لبھاتا ہے اگرچہ حسنِ دریا ڈر رہا ہوں میں	۱۷۱
۱۰۸	پرزے بن کر اڑ گئیں پریاں گہری نیند کی... خواب کے	۱۷۲
۱۰۹	سدا سہاگ ہو گودی رہے بھری تیری	۱۷۳

۱۱۰	تیری تلاش میں چل تو پڑا ہوں جانے تجھے پاؤں کہ نہ پاؤں	۱۷۴
۱۱۱	خبر کیا تجھ کو پیارے دردِ ہستی کے شکنجے کی... بستر میں نہیں ہوگی	۱۷۵
۱۱۲	وہی نظر کہ جو اٹھتی رہی مری جانب... خیال بھی تھا	۱۷۶
۱۱۳	زندگی سے ایک دن موسم خفا ہو جائیں گے	۱۷۷
۱۱۴	چھن گئی تیری تمنا بھی تمنائی سے	۱۷۸
۱۱۵	رات پچھلے پہر وہ ہوائیں چلیں پھول رونے لگے زخم گانے لگے	۱۷۹
۱۱۶	کس شے پہ یہاں وقت کا سایہ نہیں ہوتا	۱۸۰
۱۱۷	وہ جو ایک وقفۂ عمر تھا تری آرزو میں بسر کیا	۱۸۲
۱۱۸	گو اس طرف سے بات کا امکاں نہ تھا کوئی	۱۸۳
۱۱۹	نین کھلتے نہ تھے نیند آتی نہ تھی رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی	۱۸۴
۱۲۰	چہروں سے پھوٹتی ہے مسرت کبھی کبھی	۱۸۵
۱۲۱	عجب نہیں کبھی نغمہ بنے فغاں میری	۱۸۶
۱۲۲	کھلی فضا میں بھی چاروں طرف سلاخیں تھیں... رہا نہ ہوا	۱۸۷
۱۲۳	کیوں میرے حال دل پر اس کی نظر نہیں ہے	۱۸۸
۱۲۴	وہ جن کے ساتھ چلتا تھا زمانہ... تنہا گئے ہیں	۱۸۹
۱۲۵	وقت نے رنگ اڑا دیئے سارے... کہاں ہے آج	۱۹۰
۱۲۶	بجھا ہو دل تو کسی کی ادا نہیں چلتی	۱۹۱
	اشعار	۱۹۳

کلیات: طباعت اول

۱۲۷	اجلا تر ابر تن ہے اور صاف ترا پانی	۱۹۹
۱۲۸	فضائے دل پہ کہیں چھا نہ جائے یاس کا رنگ	۲۰۰
۱۲۹	اشک دامن میں بھرے خواب کمر پر رکھا	۲۰۱
۱۳۰	یہ کس ترنگ میں ہم نے مکان بیچ دیا	۲۰۲
۱۳۱	کوئی نہیں جو کہے داستان موسم گل	۲۰۳
۱۳۲	برس کر کھل گیا ابر خزاں آہستہ آہستہ	۲۰۴
۱۳۳	مل ہی آتے ہیں اسے ایسا بھی کیا ہو جائے گا	۲۰۵
۱۳۴	وہ جو بے کلی مرے دل کو تھی وہ جو اضطراب تھا اب کہاں	۲۰۶

نیا کلام

۱۳۵	صورتیں بدلیں محبت نے جوانی میں بہت	۲۰۹
۱۳۶	ہو گیا شہر پرندوں کی صدا سے خالی	۲۱۰

۱۳۷	تھا مجھ سے ہم کلام مگر دیکھنے میں تھا	۲۱۱
۱۳۸	ہوئے شاخ شاخ دھواں گئے موسموں کے ملال میں	۲۱۲
۱۳۹	دریچے کھل رہے ہیں شور برپا ہے مکانوں میں	۲۱۳
۱۴۰	کلی کھلی کسی بھولی ہوئی ادا کی طرح	۲۱۴
۱۴۱	آنسوؤں سے نہ ڈرو آہ و بکا ہونے دو	۲۱۵
۱۴۲	اس کی کنج گلی سے آگے گلیاں کوچے اور بھی ہیں	۲۱۶
۱۴۳	یہ سلگتے در و دیوار یہ جلتا موسم	۲۱۷
۱۴۴	سب اگلے پچھلے سے لوٹ آئے پانی میں	۲۱۸
۱۴۵	شبنم کو ریت پھول کو کانٹا بنا دیا	۲۱۹
۱۴۶	دل میں وہ شور نہ آنکھوں میں وہ نم رہتا ہے	۲۲۰
۱۴۷	کہاں کی گونج دل ناتواں میں رہتی ہے	۲۲۱
۱۴۸	وہ لڑکپن کے دن وہ پیار کی دھوپ	۲۲۲
۱۴۹	کس جھٹپٹے کے رنگ اجالوں میں آ گئے	۲۲۳
۱۵۰	دھڑکتی رہتی ہے دل میں طلب کوئی نہ کوئی	۲۲۴
۱۵۱	شام غم یاد ہے کب شمع جلی یاد نہیں	۲۲۵
۱۵۲	وہ ابھی محو ناز تھے اپنے لب و عذار میں	۲۲۶
۱۵۳	شمعیں خموش ہو گئیں پروانے سو گئے	۲۲۷
۱۵۴	پھر دل کو نئی خوشی سے بھر جا	۲۲۸
۱۵۵	اک پھول کہیں مہک رہا ہے	۲۲۹
۱۵۶	پتہ اب تک نہیں بدلا ہمارا	۲۳۰
۱۵۷	وابستہ ہیں اس جہان سے ہم	۲۳۱
۱۵۸	کبھی کبھی ہم ایسے باتیں کرتے ہیں	۲۳۲
۱۵۹	کرتے رہیں دور سے نظارے	۲۳۳
۱۶۰	یوں تو در وا تھے بہت فکر و عمل کی جانب	۲۳۵
۱۶۱	لکھے تھے حرف ترے نام کے درختوں میں	۲۳۶
۱۶۲	چشم و لب کیسے ہوں رخسار ہوں کیسے تیرے	۲۳۷
۱۶۳	دل سے کبھی گذرا تھا آغاز جوانی میں	۲۳۸
۱۶۴	دم گھٹا جاتا ہے سبزے کی فراوانی سے	۲۳۹
۱۶۵	پانی میں عکس اور کسی آسماں کا ہے	۲۴۰
۱۶۶	تھم گیا درد، اجالا ہوا تنہائی میں	۲۴۱
۱۶۷	اب وہ گلیاں وہ مکاں یاد نہیں	۲۴۲

۱۶۸	مونس دل کوئی نغمہ کوئی تحریر نہیں	۲۴۳
۱۶۹	رہ شوق میں کیا ہوا کون جانے	۲۴۴
۱۷۰	بتا رہا تھا کوئی آشنائے آب رواں	۲۴۵
۱۷۱	ہم ہیں اب اور گھر ہمارا ہے	۲۴۶
۱۷۲	دیکھیے ہوتی ہے کب نشو ونما پانی کی	۲۴۷
۱۷۳	پھر وہی آنسو وہی خاموشیاں سازوں کے بعد	۲۴۸
۱۷۴	بام و دیوار و در نہیں کوئی	۲۴۹
۱۷۵	رات پھر رنگ پہ تھی اس کے بدن کی خوشبو	۲۵۱
۱۷۶	بغداد میں صبح: وہی ان کی ستیزہ کاری ہے	۲۵۲
۱۷۷	دل کا بوجھ تو ہلکا ہوتا	۲۵۳
۱۷۸	اس حسن بے اماں کی حفاظت میں ہوں کہ جو...انداز بھی نہ ہو	۲۵۴
۱۷۹	خوشی ضرور ملی لیکن اس قدر بھی نہیں...بچا رکھتے	۲۵۵
۱۸۰	کھڑے ہیں دل میں جو برگ وثمر لگائے ہوئے	۲۵۶
۱۸۱	ان موسموں میں ناچتے گاتے رہیں گے ہم	۲۵۷
۱۸۲	گردش میں پیمانے آئے	۲۵۸
۱۸۳	میں بے وجہ روتا رہا رات بھر	۲۵۹
۱۸۴	جب پرندے پس دیوار خزاں بولتے ہیں	۲۶۰
۱۸۵	ملال دل سے علاج غم زمانہ کیا	۲۶۱
۱۸۶	یہ کون خواب میں چھو کر چلا گیا مرے لب	۲۶۲
۱۸۷	چمک دمک پہ نہ جاؤ کھری نہیں کوئی شے	۲۶۳
۱۸۸	اب منزل صدا سے سفر کر رہے ہیں ہم	۲۶۵
۱۸۹	مجھے اس نے تری خبر دی ہے	۲۶۷
	اشعار	۲۶۹

مجموعہ

باراول : ۱۹۶۶
سرورق : شاکر علی
ناشر : محمد حنیف رامے
البیان، چوک انارکلی، لاہور
طابع : استقلال پریس، لاہور

غالب احمد

کے نام

درہمی حال کی ہے ساری مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

میر

rekhta

۱۹۵۳

سے

۱۹۶۳

تک

ترے دیوانے ہر رنگ رہے ترے دھیان کی جوت جگائے ہوئے
کبھی نتھرے ستھرے کپڑوں میں کبھی انگ بھبھوت رمائے ہوئے

اس راہ سے چھپ چھپ کر گذری رت سبز سنہرے پھولوں کی
جس راہ پہ تم کبھی نکلے تھے گھبرائے ہوئے شرمائے ہوئے

اب تک ہے وہی عالم دل کا وہی رنگ شفق وہی تیز ہوا
وہی سارا منظر جادو کا میرے نین سے نین ملائے ہوئے

چہرے پہ چمک آنکھوں میں حیا لب گرم خنک چھب نرم نوا
جنھیں اتنے سکون میں دیکھا تھا وہی آج ملے گھبرائے ہوئے

ہم نے مشتاق یوں ہی کھولا یادوں کی کتاب مقدس کو
کچھ کاغذ نکلے خستہ سے کچھ پھول ملے مرجھائے ہوئے

تو آپ سے آپ آ گیا تھا
میں کب تجھے ڈھونڈھنے چلا تھا

اب رات تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجیب سا لگا تھا

دبلا پتلا نحیف سا چاند
شاخوں سے پرے گذر رہا تھا

بدلی بوندیں اتارتی تھی
اب چاند رکا ہوا کھڑا تھا

rekhta

بادل کی گرج ڈراؤنی تھی
چھاجوں پانی برس رہا تھا

کوئی بے حد پرانا نغمہ
ساحل سے بلند ہورہا تھا

ساز و آواز دینے والے
مشتاق فقیر بے نوا تھا

rekhta

شفق میں رنگ ہیں بیتے ہوئے زمانے کے
بہت اداس ہیں دن تیرے یاد آنے کے

وہ پتیوں سے بھری ٹہنیاں تری بانہیں
بلا رہے ہیں شجر تیرے آستانے کے

وہ جن دنوں میں کرم بے حساب تھا تیرا
وہی تو دن تھے مرے کھیلنے کے کھانے کے

سفر میں منزل واماندگی بھی شامل ہے
اٹھا رہا ہوں مزے تھک کے بیٹھ جانے کے

سلگ رہی ہے فضا میں بہار کی خوشبو
چمن سے دور کھلے پھول آشیانے کے

گم ہے انھیں گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا
یہ جھانکنا یوں ہی تو نہیں در بدر اپنا

آنکھوں ہی سے شاید کوئی صورت نکل آئے
باتوں سے تو قصہ نہ ہوا مختصر اپنا

اب شوق کی آواز نہیں دور کی آواز
اب کر بھی چکیں کام یہ قلب و نظر اپنا

اب آنکھ بھی نم درد بھی کم تیرے لئے ہے
اب گریۂ شب ہے نہ سکون سحر اپنا

دل ہی تو نہیں منزل آشفتہ مزاجاں
اس آبلے پر ختم نہیں ہے سفر اپنا

رسے کے پلوں پر سے گذرتے ہیں مسافر
ٹھہری ہوئی جھیلوں میں گھرا ہے نگر اپنا

چاند بھی نکلا ستارے بھی برابر نکلے
مجھ سے اچھے تو شب غم کے مقدر نکلے

شام ہوتے ہی برسنے لگے کالے بادل
صبح دم لوگ دریچوں میں کھلے سر نکلے

کل ہی جن کو تیری پلکوں پہ کہیں دیکھا تھا
رات اسی طرح کے تارے مری چھت پر نکلے

دھوپ ساون کی بہت تیز ہے دل ڈرتا ہے
اس سے کہہ دو کہ ابھی گھر سے نہ باہر نکلے

پیار کی شاخ تو جلدی ہی ثمر لے آئی
درد کے پھول بڑی دیر میں جا کر نکلے

دل ہنگامہ طلب یہ بھی خبر ہے تجھ کو
مدتیں ہوگئیں اک شخص کو باہر نکلے

چھٹ گیا ابر شفق کھل گئی تا رے نکلے
بند کمروں سے ترے درد کے مارے نکلے

شاخ پر پنکھڑیاں ہوں کہ پلک پر آنسو
تیرے دامن کی جھلک دیکھ کے سارے نکلے

تو اگر پاس نہیں ہے کہیں موجود تو ہے
تیرے ہونے سے بڑے کام ہمارے نکلے

تیرے ہونٹوں مری آنکھوں سے نہ بدلی دنیا
پھر وہی پھول کھلے پھر وہی تارے نکلے

رہ گئی لاج مری عرض وفا کی مشتاق
خامشی سے تری کیا کیا نہ اشارے نکلے

rekhta

رنگ کیا کیا نہ دکھانے آئے
یار پھر مجھ کو منانے آئے

قصرِ ویراں کے پرانے سپنے
جاگتی آنکھ سلانے آئے

سوئیں شاخوں سے لپٹ کر کرنیں
زرد پھولوں کے زمانے آئے

اب نہ کلیوں کے دریچوں میں صبا
بات کرنے کے بہانے آئے

ان مکینوں کو مکاں روتے ہیں
جو انھیں پھر نہ بسانے آئے

خالی ڈھنڈار پڑی ہے بستی
پھر کوئی آگ جلانے آئے

پھر نہیں ٹھور ٹھکانا اپنا
کیا خبر کون بلانے آئے

rekhta

نین ساگر میں چلی رات کی ناؤ
کون اب پار لگانے آئے

کتنے دن ڈوب گئے غم نہ ہوا
کون اس درد کو جانے، آئے

برگ صد رنگ ہے اندیشۂ حسن
کوئی دیکھے کوئی مانے، آئے

نہ ملی جوہر بے زخم کی داد
ہم بہر رنگ دکھانے آئے

کوئی لے جس سے ستارے شق ہوں
دل کو خوابوں سے جگانے آئے

کھل گیا راز تمنا مشتاق
ہمیں آنسو نہ بہانے آئے

چھوڑ آتی ہے کہاں ان کو ستم گر چاندنی
جو اتر آتے تھے دل میں ساتھ لے کر چاندنی

بھیجنے والے ! انھی خاموش مہمانوں کو بھیج
تو برابر بھیجتا رہتا تھا جن پر چاندنی

جن پہ بچھتی تھی کبھی گہرے خنک سایوں کی سیج
ان منڈیروں سے لپٹ جاتی ہے اکثر چاندنی

دل میں اٹھتا ہے انھی لمحوں کی آوازوں کا شور
جن کی خدمت میں رہا کرتی تھی اکثر چاندنی

پہلے در آتی تھی جب بستی میں آتا تھا کوئی
اب کھڑی رہتی ہے دروازوں کے باہر چاندنی

جب کھلی آنکھوں میں رکتے ہیں ہوا کے قافلے
جاگتی مٹی پہ سو لیتی ہے دم بھر چاندنی

یہ تنہا رات یہ گہری فضائیں
اسے ڈھونڈیں کہ اس کو بھول جائیں

خیالوں کی گھنی خاموشیوں میں
گھلی جاتی ہیں لفظوں کی صدائیں

یہ رستے رہروؤں سے بھاگتے ہیں
یہاں چھپ چھپ کے چلتی ہیں ہوائیں

یہ پانی خامشی سے بہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

جو غم جلتے ہیں شعروں کی چتا میں
انھیں پھر اپنے سینے سے لگائیں

چلو ایسا مکاں آباد کرلیں
جہاں لوگوں کی آوازیں نہ آئیں

کہاں ڈھونڈھیں اسے کیسے بلائیں
یہاں اپنی بھی آوازیں نہ آئیں

پرانا چاند ڈوبا جا رہا ہے
وہ اب کوئی نیا جادو جگائیں

اب ایسا ہی زمانہ آ رہا ہے
عجب کیا وہ تو آئیں ہم نہ آئیں

ہوا چلتی ہے پچھلے موسموں کی
صدا آتی ہے ان کو بھول جائیں

بس اب لے دے کے ہے ترک تعلق
یہ نسخہ بھی کوئی دن آزمائیں

rekhta

بہتا آنسو ایک جھلک میں کتنے روپ دکھائے گا
آنکھ سے ہو کر گال بھگو کر مٹی میں مل جائے گا

بھولنے والے! وقت کے ایوانوں میں کون ٹھہرتا ہے
بیتی شام کے دروازے پر کس کو بلانے آئے گا

آنکھ مچولی کھیل رہا ہے اک بدلی سے اک تارا
پھر بدلی کی یورش ہوگی پھر تارا چھپ جائے گا

اندھیارے کے گھور نگر میں ایک کرن آباد ہوئی
کس کو خبر ہے پہلا جھونکا کتنے پھول کھلائے گا

پھر اک لمحہ آن رکا ہے وقت کے سونے صحرا میں
پل بھر اپنی چھب دکھلا کر لمحوں میں مل جائے گا

منھ دیکھے کی ساری باتیں روٹھو گے کہ مناؤ گے
دل کو کیسے رام کرو گے کون سا رنگ دکھاؤ گے

کتنی خوشیاں ناچ رہی ہیں سانجھ سمے کی اداسی میں
ڈال ڈال پہ تھرکتے پتو ہنس ہنس کر مرجھاؤ گے

جاگتی آنکھوں صبح کے سپنے ڈوب چلے اندھیاروں میں
کب تک جھوٹی تعبیروں سے اپنا من بہلاؤ گے

میں تھک ہار چکا ہوں مجھ میں اتنی سکت کب باقی ہے
کچھ تو بتاؤ اڑتے پتو ! اور کہاں لے جاؤ گے

شاید تم کو ڈھونڈ ھنے نکلیں جی کی اداسی زور کرے
جانے والو! کن راہوں پرؔ پھول گراتے جاؤ گے

دل میں چبھن سی رہتی ہے مشتاق تو کوئی غزل لکھو
کب تک اوروں کے شعروں کو اپنے شعر بناؤ گے

rekhta

کس کی تلاش میں چلے عشق کے خانماں خراب
چشم تمام تیرگی زخم تمام ماہتاب

سر پہ مثال آسماں چادر غم تنی ہوئی
زیر قدم بچھا ہوا حسن کا دشت بے سراب

خامشیاں دمن دمن روشنیاں چمن چمن
یاد کے اپنے مشرقین شوق کے اپنے آفتاب

میں، مرے ہم نشیں، تمام نکتہ سرائے بزم عام
تیرے حریم خاص میں کوئی نہیں ہے باریاب

rekhta

برگ کہیں، شجر کہیں، شاخ کہیں، ثمر کہیں
آج ورق ورق ملی عہد بہار کی کتاب

کس کی نگاہ کھا گئی، کون ہوا اڑا گئی
خواب کی ٹہنیوں کے پھول، پھول کی ٹہنیوں کے خواب

پرچم صبح کی اڑان، گرم دلوں کی آرزو
زرد لبوں کی جستجو ایک دعاے مستجاب

rekhta

دور خزاں کی صبح سے بھید ملے بہار کے
جبر کی رات میں کھلے دن مرے اختیار کے

اب کہیں آسمان پر رنگ نہیں صفا نہیں
آنکھ پہ میل آگیا شہر میں دن گذار کے

ہم کہیں کھو گئے وہیں تیری گلی کے آس پاس
اپنے گھروں کو چل دیئے لوگ تجھے پکار کے

دیکھ کے زرد رو پہاڑ ساری تکان اتر گئی
کون زمیں پہ رکھ گیا بار سفر اتار کے

rekhta

رات ڈراؤنی سہی رو نہیں غم زدہ نہ ہو
میں ترے ساتھ ساتھ ہوں دیکھ مجھے پکار کے

صبح ہوئی تو سارا گھر روشنیوں سے بھر گیا
رنگ بکھر بکھر گئے گیسوے تابدار کے

اب کوئی اور بھی تو ہو وجہ بحالی جنوں
بیٹھ گئی بہار کیوں دامن گل پسار کے

rekhta

منظر صبح دکھانے اسے لایا نہ گیا
آتی جاتی رہیں شامیں کوئی آیا نہ گیا

رات بستر پہ کھلے چاند میں سوتا تھا کوئی
میں نے چاہا کہ جگاؤں تو جگایا نہ گیا

ایک مدت اسے دیکھا اسے چاہا لیکن
وہ کبھی پاس سے گذرا تو بلایا نہ گیا

گھیرے رہتی تھیں اسے ایک جہاں کی نظریں
پھر جو دیکھا تو وہ اس آن میں پایا نہ گیا

سر اٹھاتے ہی کڑی دھوپ کی یلغار ہوئی
دو قدم بھی کسی دیوار کا سایہ نہ گیا

تھا مقرر کہ ملاقات رہے گی اس سے
وہ تو پہنچا تھا مگر مجھ سے ہی آیا نہ گیا

کل یہی رات تھی ، نیند آئی تھی حسب معمول
اب وہی رات کھڑی ہے شب ہجراں بن کر

کہیں پتی کہیں کانٹا کہیں شاخیں کہیں پھول
وہ مرے سامنے آتا ہے گلستاں بن کر

جب سر راہ تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
چاندنی ساتھ لگی تھی ترا داماں بن کر

اجنبی جسم کے ساحل کے سنہرے ذرے
کبھی چمکیں گے تری مانگ میں افشاں بن کر

جو شب و روز کی محنت سے سرانجام نہ ہوں
ہم نے وہ کام سنوارے ہیں تن آساں بن کر

وہی باتیں جنھیں اب سوچ کے ہنس دیتا ہوں
ہو نہ جائیں کہیں ظاہر غم پنہاں بن کر

rekhta

آنکھیں تو نہ مانیں گی آنکھوں کو تو بہنا ہے
اب دل سے الجھنا ہے ان سے نہیں کہنا ہے

ویران درختوں کی ٹوٹی ہوئی بانہوں سے
اب کچھ بھی نہیں کہنا بس دیکھتے رہنا ہے

ہر ظلم سہا جائے خاموش رہا جائے
کچھ بھی نہ کہا جائے یہ بھی تو الہنا ہے

ڈوبی ہوئی آوازیں ٹوٹے ہوئے سناٹے
یہ سب مری باتیں ہیں یہ سب مرا کہنا ہے

یہ کہہ کے پہاڑوں سے منہ موڑ گئے دریا
اب اپنے مقدر میں میدان کا بہنا ہے

rekhta

ترانۂ غم دل قصۂ شب محزوں
سنے تو کون سنے اور کہوں تو کس سے کہوں

بڑے گلاب کی شاخیں پسند ہیں مجھ کو
مرا نصیب یہی ہے کہ دور سے دیکھوں

زمیں کی پیاس مرے آنسوؤں سے بجھتی ہے
مگر یہ بات کھڑے بادلوں سے کیسے کہوں

یہ زرد شاخ مجھے کیوں اجاڑ دیتی ہے
اگر برا نہ مناؤ تو اس سے پوچھ ہی لوں

مرا وجود تو جب ہے کہ تم بھی ہو موجود
اب اپنے آپ سے باتیں کروں کہ تم سے کروں

rekhta

روشنی گو مرے سخن میں نہیں
دل میں جو چاند ہے گہن میں نہیں

چاک سب بند ہیں گریباں کے
دل کا اک تار پیرہن میں نہیں

ریت میں دب کے مر گیا ہوگا
اب وہ آہو کسی ختن میں نہیں

ہونٹ کا چاند نین کا تارا
میری تنہائیوں کے بن میں نہیں

رنگ و نکہت ہوا کے ساتھی ہیں
پھول کا آشیاں کرن میں نہیں

rekhta

آنکھ اٹھاتا ہوں تو ہٹ جاتے ہیں
دن ترے دھیان میں کٹ جاتے ہیں

ابر اندیشہ بکھرتا ہی نہیں
اور بادل ہیں جو چھٹ جاتے ہیں

کسی بے نام ہوا کے جھونکے
درد کی تان پلٹ جاتے ہیں

زلزلے ہیں کہ تمھاری یادیں
دھیان کے شہر الٹ جاتے ہیں

rekhta

ذائقے بن کے پرانے موسم
میرے تالو سے چمٹ جاتے ہیں

کون منزل کا سفر ہے درپیش
راستے راہ سے ہٹ جاتے ہیں

ہاتھ کاغذ پہ دھرے بیٹھا ہوں
شعر آ آ کے پلٹ جاتے ہیں

rekhta

جلتے جلتے بنے پتنگے
روئیں بے اختیار شمعیں

خالی کمروں میں پھر رہا ہوں
بجھ جاتی ہیں بار بار شمعیں

آنکھیں پگھلا کے سو گئی ہیں
تھیں رونق انتظار شمعیں

میں کون ہوا سے لڑنے والا
لیکن سر رہگذار شمعیں

rekhta

رستے سب بند ہو گئے ہیں
جلتی ہیں پسِ غبار شمعیں

ساحل کی ہوا میں لڑکھڑائیں
ٹھہری ہوئی بے کنار شمعیں

لکھ لو ابھی روشنی ہے مشتاق
جلتیں نہیں بار بار شمعیں

rekhta

مرے خوابوں میں کب زلفوں کو بکھرا کر نہیں آیا
وہ پیکر جو کسی دروازے سے باہر نہیں آیا

کسے معلوم جس کے واسطے محفل سجائی تھی
وہ کیوں دہلیز تک آیا تھا کیوں اندر نہیں آیا

ابھی بیٹھے رہیں اس شمع رو کی انجمن والے
ابھی آوازۂ دریاے خاکستر نہیں آیا

میں اس مٹی کا ذرہ ہوں جو صحرا پر نہیں برسی
میں اس بادل کا ٹکڑا ہوں جو دریا پر نہیں آیا

میں اس آنسو کو روتا ہوں جو مژگاں تک نہیں پہنچا
جو مژگاں تک اگر پہنچا تو دامن پر نہیں آیا

رلاتی ہیں مجھے اس کے جواں لفظوں کی فریادیں
جو الہامی صحیفہ تھا مگر مجھ پر نہیں آیا

چاند اس گھر کے دریچوں کے برابر آیا
دل مشتاق ٹھہر جا وہی منظر آیا

میں بہت خوش تھا کڑی دھوپ کے سناٹے میں
کیوں تری یاد کا بادل مرے سر پر آیا

بجھ گئی رونق پروانہ تو محفل چمکی
سو گئے اہل تمنا تو ستم گر آیا

یار سب جمع ہوئے رات کی خاموشی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

rekhta

ٹوٹتا ہے کلی کلی کا خمار
چلی پھولوں کی وادیوں سے بہار

اپنی دھن میں گذر گیا کوئی
اور کھلے رہ گئے دلوں کے دوار

کوئی ڈھونڈو کوئی سراغ لگاؤ
انھیں پتوں میں چھپ گئی ہے بہار

کتنے عالم ورائے عالم ہیں
کبھی دیکھو نگاہ کے اس پار

سن اے ہر قدم پر ٹھہر جانے والے
یہ سب قافلے ہیں گذر جانے والے

جہاں سوکھتی گھاس بکھری پڑی ہے
یہ تختے تھے پھولوں سے بھر جانے والے

کہاں گم ہوئے وقت کی وسعتوں میں
چڑھے پانیوں میں اتر جانے والے

گھنی تیرگی میں بھٹکتے پھریں گے
گھروں میں سر شام ڈر جانے والے

جنھیں لکھ کے مشتاق پچھتا رہے ہو
وہی شعر ہیں کام کر جانے والے

rekhta

شاخ سے دور شاخسار سے دور
پھول کھلتے رہے بہار سے دور

اجنبی رہزنوں نے لوٹ لئے
کچھ مسافر ترے دیار سے دور

ان گنت قافلے گزرتے رہے
منزل غم کی رہگذار سے دور

کیا خبر کتنے دل تڑپتے رہے
کاہش وصل و انتظار سے دور

دل نے کچھ بستیاں بسائی ہیں
شہر سے دور شہر یار سے دور

لئے جاتا ہے کاروان خیال
عالم جبر و اختیار سے دور

rekhta

اداس کر کے دریچے نئے مکانوں کے
ستارے ڈوب گئے سبز آسمانوں کے

گئی وہ شب جو کبھی ختم ہی نہ ہوتی تھی
ہوائیں لے گئیں اوراق داستانوں کے

ہر آن برق چمکتی ہے دل دھڑکتا ہے
مری قمیص پہ تنکے ہیں آشیانوں کے

ترے سکوت سے وہ راز بھی ہوئے افشا
کہ جن کو کان ترستے تھے رازدانوں کے

یہ بات تو جرسِ شوق کو بھی ہے معلوم
قدم اٹھیں گے تو بس تیرے ناتوانوں کے

کوئی اپنی دھن میں گذر جائے گا
کوئی چلتے چلتے ٹھہر جائے گا

بڑے چاند کی آخری رات ہے
وہ دفتر سے نکلا تو گھر جائے گا

پون بین باجی درختوں سے دور
وہ رستے میں ہوگا تو ڈر جائے گا

انوکھی چمک اس کے چہرے پہ تھی
مجھے کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

جو اڈے ہیں آنسو تو روکیوں نہ لیں
چلو بوجھ سر سے اتر جائے گا

rekhta

بھٹک نہ جائیں کہیں رہروان راہ وفا
کہ اس سفر میں کوئی قافلہ نہیں ملتا

لبوں پہ گیت، نگاہوں میں روشنی کی جھلک
مگر دلوں میں گھنے جنگلوں کا سناٹا

سلگ رہی ہے دلوں میں کسی کے درد کی آگ
یہ زرد چاند، یہ پچھلے پہر کی نرم ہوا

بہت دنوں سے ہے سنسان رہگذار حیات
نہ کوئی خاک بسر ہے نہ کوئی آبلہ پا

طلسم خامشی رہگذر کو توڑتی ہے
کسی کی چاپ سے پتوں کے ٹوٹنے کی صدا

ترے وصال کے لمحے عجب طرح گذرے
نظر خموش دلوں میں قیامتیں برپا

بہت عجیب ہے افسانۂ دل مشتاق
کہ یہ دیار اجڑ بھی گیا بسا بھی رہا

rekhta

پوچھتے ہیں کہ مری بے خبری کیسی ہے
پوچھنے والوں کی بے بال و پری کیسی ہے

دل بدستور ہے آئینۂ ایام جمال
تو بتا تیری پریشاں نظری کیسی ہے

میں تو پھرتا ہوں کہ مل جائے ٹھکانا کوئی
تو جو نکلا ہے تری دربدری کیسی ہے

میں تو جاؤں گا جہاں تو مجھے ملنے آئے
میرے ہمراہ تری ہمسفری کیسی ہے

rekhta

کوئی موسم ہو گریباں نہیں پھٹنے پاتے
گردشِ قسمت آشفتہ سری کیسی ہے

آنکھ کھلتی ہے تو دل ڈوبنے لگ جاتا ہے
آج تاثیر ہوائے سحری کیسی ہے

کوئی موجود نہیں اور کھلی ہیں آنکھیں
مرنے والے کی یہ دریوزہ گری کیسی ہے

کہوں کس سے رات کا ماجرا نئے منظروں پہ نگاہ تھی
نہ کسی کا دامن چاک تھا نہ کسی کی طرف کلاہ تھی

کئی چاند تھے سر آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

دل کم الم پہ وہ کیفیت کہ ٹھہر سکے نہ گذر سکے
نہ حضر ہی راحت روح تھا نہ سفر میں رامش راہ تھی

مرے چار دانگ تھی جلوہ گر وہی لذت طلب سحر
مگر اک امید شکستہ پر کہ مثال درد سیاہ تھی

وہ جو رات مجھ کو بڑے ادب سے سلام کر کے چلا گیا
اسے کیا خبر مرے دل میں بھی کبھی آرزوے گناہ تھی

ابھی جن کے دم قدم سے مرے رت جگے ہیں روشن
کہیں دل میں بجھ نہ جائیں وہی طلعتیں پرانی

نئے پیار کے اندھیرے مجھے کیا ڈرا سکیں گے
مرا دل بڑھا رہی ہیں مری چاہتیں پرانی

نئی زندگی نے مجھ کو نئے غم عطا کئے ہیں
مجھے کیا سنا رہے ہو یہ حکایتیں پرانی

نہ رتیں بدل رہی ہیں نہ فنا میں ڈھل رہی ہیں
مرے ساتھ چل رہی ہیں وہی عادتیں پرانی

rekhta

ترے چھوٹے چھوٹے فقرے مرے ننھے ننھے آنسو
نہ طبیعتیں پرانی ، نہ محبتیں پرانی

مرے بولنے کا موسم نہ قریب آرہا ہو
کہیں دل میں گونجتی ہیں وہ سماعتیں پرانی

rekhta

میں وہ نہیں جو کلبۂ احزاں میں بند ہے
تو وہ نہیں جو ہے سر محفل گھرا ہوا

دریا کا پیچ و تاب بھنور کا اسیر ہے
زنجیر عافیت میں ہے ساحل گھرا ہوا

رستوں کے موڑ پاؤں کو زنجیر ہو گئے
چلتا رہا ہوں جانب منزل گھرا ہوا

گذری ہے آج یوں مرے دل سے کسی کی یاد
جیسے غبار میں کوئی محمل گھرا ہوا

چھائی ہوئی ہے غم کی گھٹا کائنات پر
کیا وقت آپڑا ہے حیات و ممات پر

کیوں تیرے حال سے مری آنکھیں نہ ہوں اداس
ہوتا ہے موسموں کا اثر پات پات پر

شاید پھر اپنے کام انھیں یاد آگئے
ہوتے تھے جو فدا تری اک ایک بات پر

دیکھا تجھے تو بھول گئے اے نگاہ یار
جو کچھ پڑھا تھا قلب کی اس واردات پر

بس اتنا یاد ہے کسی محفل کا ذکر تھا
تم مسکرا دیئے تھے مری ایک بات پر

مشتاق جن کو دیکھ کے ہنس چھوڑتے ہو تم
رویا کریں گے لوگ انھیں واقعات پر

تاروں سے پرے نکلنے والے
دم توڑ گئے چلا چلی میں

چونک اٹھتے ہیں اونگھتے دریچے
وہ شور نہیں رہا گلی میں

شاید چمکیں مرے مقدر
پھرتا ہے لہو کلی کلی میں

rekhta

لے کے ہمراہ چھلکتے ہوئے پیمانے کو
آن پہنچی ہے یہ ساعت بھی گذر جانے کو

ہاں اسے رہگذر خندۂ گل کہتے ہیں
ہاں یہی راہ نکل جاتی ہے ویرانے کو

فائدہ بھی کوئی جل جل کے مرے جانے سے
کون اس شمع سے روشن کرے پروانے کو

سنگ اٹھانا تو بڑی بات ہے اب شہر کے لوگ
آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے دیوانے کو

کل بھی دیکھا تھا انھیں آج بھی درشن ہوں گے
حسب معمول وہ نکلیں گے ہوا کھانے کو

مسلسل یاد آتی ہے چمک چشم غزالاں کی
اکیلی ذات ہے اور رات ہے جنگل بیاباں کی

ذرا دیکھو ہوائے صبح کیسے کھینچ لائی ہے
اکیلی پنکھڑی میں دلکشی سارے گلستاں کی

انھیں گلیوں میں کھلتے تھے ملاقاتوں کے دروازے
انھیں گلیوں میں چلتی ہیں ہوائیں شام ہجراں کی

کوئی ذرے کو ذرہ ہی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے
کسی کو سوجھتی ہے اس سے تعمیر بیاباں کی

یہ وہ موسم ہے جس میں کوئی پتہ بھی نہیں ہلتا
دل تنہا اٹھاتا ہے صعوبت شام ہجراں کی

یہی کافی ہے دل سے مدتوں کا بوجھ تو اترا
چلو اس چشم گریاں نے کوئی مشکل تو آساں کی

ستارے درد کی آواز سے غافل نہیں رہتے
دم آہو سے روشن مشعلیں ریگ بیاباں کی

کہو کیسے اب سناؤں تمھیں نغمۂ جدائی
کوئی لے گیا اٹھا کر میرا ساز بے نوائی

قسم ان محبتوں کی جنھیں تم بھلا چکی ہو
ابھی دن ڈھلا نہیں تھا کہ تمھاری یاد آئی

کہو کوئی ایک پل میں اسے کیسے بھول جائے
جو نظر سے چھپ گئے پر، دیا دور تک دکھائی

مرے ہمسفر بتائیں یہ مقام شوق کیا ہے
نہ اوائل جدائی نہ طلوع آشنائی

مرے چار سو مہک ہے مرے اولیں لہو کی
مجھے پھر بلا رہا ہے وہی دشت دلربائی

اسی دشت میں جلے تھے مری خواہشوں کے خیمے
اسی راہ میں لٹے گی مری یاد کی کمائی

rekhta

دل اندر سے کچھ کہتا تھا
باہر کچھ کرتا رہتا تھا

خوشی ہمیں کو راس نہ آئی
پیارے تو سچ ہی کہتا تھا

جس رستے سے ابھی گذرے ہیں
پہلے یہاں دریا بہتا تھا

برے کام کا انت برا ہے
میں تو پہلے ہی کہتا تھا

ہجر میں طور ہی اور تھا میرا
روتا تھا اور خوش رہتا تھا

آخر تمام داغ مٹے زخم بھر گئے
باتیں کسی کی یاد رہیں دن گذر گئے

کس کو خبر طلب کی اندھیری رتوں سے دور
غم کے سفید پھول کھلے اور بکھر گئے

گوشوں میں دل کے اب کوئی خواہش نہیں رہی
ان ٹہنیوں سے سارے پرندے اتر گئے

جو ساحل مراد کے لمبے سفر پہ تھے
بول اے ہوائے غم وہ سفینے کدھر گئے

rekhta

اپنی نظر کو اور مناظر بھی تھے پسند
ہم رفتہ رفتہ اس کی گلی سے گذر گئے

وہ میرے ہمصفیر تو تھے ہمسفر نہ تھے
جو تھوڑی دور ساتھ چلے پھر بکھر گئے

اک تہمت ستم بھی اٹھانے نہ دی اسے
کیا لوگ تھے کہ ایک ہی دھمکی میں مر گئے

اک پھول میرے پاس تھا اک شمع میرے ساتھ تھی
باہر خزاں کا زور تھا اندر اندھیری رات تھی

ایسے پریشاں تو نہ تھے ٹوٹے ہوئے سناٹے
جب عشق کی تیرے مرے غم پر، بسر اوقات تھی

کچھ تم کہو تم نے کہاں کیسے گذارے روز و شب
اپنے نہ ملنے کا سبب تو گردش حالات تھی

اک خامشی تھی تر بتر دیوار مژگاں سے ادھر
پہنچا ہوا پیغام تھا برسی ہوئی برسات تھی

سب پھول دروازوں میں تھے سب رنگ آوازوں میں تھے
اک شہر دیکھا تھا کبھی اس شہر کی کیا بات تھی

یہ ہیں نئے لوگوں کے گھر سچ ہے اب ان کو کیا خبر
دل بھی کسی کا نام تھا غم بھی کسی کی ذات تھی

یک جہتی جنوں سے گریزاں ہے آج بھی
شیرازۂ خیال پریشاں ہے آج بھی

آتے ہیں اب بھی طشت تمنا میں لخت دل
خون جگر قیامت مژگاں ہے آج بھی

کھینچے پھرے ہے نوحۂ زنجیر بے صدا
عزم شکستن در زنداں ہے آج بھی

خلعت طلب ہے شعبدہ آرائی سخن
چشم خیال آئینہ ساماں ہے آج بھی

سونے پڑے تھے کل بھی تحیر کے راستے
ویرانی نگاہ پریشاں ہے آج بھی

دھیمی ہے مسافروں کی رفتار
کھلنے لگے راستوں کے اسرار

کس نے پھینکی کمند آواز
گرنے لگے خامشی کے مینار

پھر ایک صدا کی وسعتوں میں
گونجے گا سکوت شام کہسار

کروٹ نہ بدل سکیں گے پتے
حائل ہوگی ہوا کی دیوار

پھر پچھلے پہر کی چاندنی میں
ہو جائیں گے کتنے درد بیدار

rekhta

اٹھیں گی سمندروں سے موجیں
گر جائیں گے روشنی کے مینار

بہ جائے گی آنکھ کی سیاہی
آرام نہ پاسکے گا بیمار

پھر کچھ نہ رہے گا دشت دل میں
خوشیوں کی فغاں نہ غم کی للکار

مارا مجھے غم کی سختیوں نے
میں نرمی صبح کا پرستار

rekhta

تنہائیوں میں نغمہ سرا ہو گیا کوئی
مجلس گراں شب کی نوا ہو گیا کوئی

لو مٹ گئے تصورِ جاناں کے فاصلے
لو رشتۂ نظر سے جدا ہو گیا کوئی

لو کاٹ لی کسی نے شب مژدۂ وصال
شائستۂ فریب وفا ہو گیا کوئی

یاد آ گئے فسونِ تمنا کے شعبدے
بیتے ہوئے دنوں کی صدا ہو گیا کوئی

آنکھیں بھی کھلی ہیں اس ہوا میں
پتے بھی کہیں کہیں ہلے ہیں

یوں دیکھ رہا ہے پھول کو پھول
جیسے کوئی اجنبی ملے ہیں

قربت ہے تمام شوق تصویر
مٹتے ہوئے رنگ فاصلے ہیں

سونے جنگل دمک اٹھیں گے
وہ پھول ابھی کہاں کھلے ہیں

rekhta

نہ باقی رہا کچھ نشانِ بہار
ہوا پتہ پتہ اڑا لے گئی

کسی بولتی آنکھ کی بے رخی
سکوتِ سخن آشنا لے گئی

جلی ٹہنیاں زرد پتوں کے ڈھیر
خزاں سب خزانے چھپا لے گئی

مرے آنسوؤں کی جھلک جس میں تھی
وہ مٹی کدھر کی ہوا لے گئی

تقدیس سحر تھی کہ نوائے دل شب تھی
وہ تم سے بچھڑ جانے کی ساعت بھی عجب تھی

کچھ سوچ کے وہ آپ ہی چہرے کا کھل اٹھنا
وہ ایک کرن روزن دیوار تعب تھی

کچھ درد بھی تھا دل کے کناروں سے بہت دور
کچھ ہم سخنی سایۂ انفاس طرب تھی

وہ ایک ملاقات کہ پھر تم نہیں آئے
وہ خامشی چشم نہ تھی جنبش لب تھی

rekhta

نت نئے منظر دکھاتا ہے ان آنکھوں کا بناؤ
پاس آ دیکھو تو ساگر دور سے دیکھو تو ناؤ

کس قدر شفاف ہوتی ہیں دلوں کی چادریں
آرزوؤں کی سیاہی کی جھلک ان کو دکھاؤ

اب چمکتی ریت کے ٹیلے ہوا کی یورشیں
اب نہ وہ نیندوں کے سکھ ساگر نہ وہ خوابوں کی ناؤ

اب کھلے سورج کی گرمی دل کا دکھ محفل کی بات
اب دنوں کے سرد ویرانوں میں یادوں کے الاؤ

تم جو تارے توڑ لاتے تھے فرازِ چرخ سے
تم میں ہمت ہے کسی ڈوبے ہوئے دن کو بلاؤ

چپکے چپکے یوں گذرتی ہے گئے لمحوں کی یاد
چاندنی راتوں میں جیسے ست دریا کا بہاؤ

کیا مسافر ہیں کہ جن سے بھاگتے ہیں راستے
اور آوازِ جرس کہتی ہے میرے پاس آؤ

rekhta

گردش شام و سحر دن کوئی ایسا نکلے
وہ مرے ساتھ ہو اور صبح کا تارا نکلے

چھپ گیا چاند کھلی زلف کی خوشبو لے کر
اب چلی آؤ کہ آنکھوں سے اندھیرا نکلے

کھو گیا ہوں تری یادوں کے گھنے جنگل میں
کیا عجب ہے جو یہیں سے کوئی رستہ نکلے

ایک مدت سے سر راہ کھڑا ہوں مشتاق
اس توقع پہ کہ شاید کوئی تجھ سا نکلے

زلف دیکھی وہ دھواں دھار، وہ چہرہ دیکھا؟
سچ بتا دیکھنے والے اسے کیسا دیکھا

رات ساری کسی ٹوٹی ہوئی کشتی میں کٹی
آنکھ بستر پہ کھلی خواب میں دریا دیکھا

زرد گلیوں میں کھلے سبز دریچے، جن میں
دھوپ لیٹی رہی اور سائے کو چلتا دیکھا

کالے کمروں میں کٹی ساری جوانی اس کی
جس نے اے خواب محبت ترا رستہ دیکھا

سنتے رہتے تھے کہ یوں ہوگا وہ ایسا ہوگا
لیکن اس کو تو کسی اور طرح کا دیکھا

نکلے تھے کسی مکان سے ہم
روٹھے رہے اک جہان سے ہم

بدنامیاں دل سے آنکھ تک تھیں
رسوا نہ ہوئے زبان سے ہم

ہے تنگ جہان بود و نابود
اترے ہیں کسی آسمان سے ہم

پھولوں میں بکھر گئے تھے رستے
گذرے نہیں درمیان سے ہم

جو شان تھی ملتے وقت مشتاق
بچھڑے اسی آن بان سے ہم

کیا صبا ڈھونڈھتی پھرتی ہے پریشاں، خالی
روزنِ گل سے ہے دیوارِ گلستاں خالی

شفقِ چشم بھی ہے شاملِ غم ہائے بہار
سرخیِ شام نہیں خونِ شہیداں خالی

اب میسر ہی نہیں وسعتِ صحرا کا خمار
نشۂ ریگ سے ہے چشمِ غزالاں خالی

وحدتِ دشت رہے جس کی چمک سے قائم
ایسے گوہر سے رہی خاکِ بدخشاں خالی

آخرِ شب کوئی دیکھے تو دلہن کی صورت
مانگ افشاں سے بھری مانگ سے افشاں خالی

سفرِ شب سے جو لوٹا تو کہیں پھول ملے
رات پھر چاند سے تھا چاند کا داماں خالی

ساتھ شبنم کے رو گئے ہم بھی
پتیاں کچھ بھگو گئے ہم بھی

ہوگئی شام راہ لامحدود
کسی جنگل میں کھو گئے ہم بھی

دور تھا ڈوبتا ہوا سورج
ہم نے سوچا کہ لو گئے ہم بھی

دیر تک گھومتے رہے آخر
سوئے پھولوں میں سو گئے ہم بھی

بوئے گل لے کے جب صبا نکلی
ساتھ چپکے سے ہو گئے ہم بھی

rekhta

ادا و ناز کو انداز دلبرانہ سمجھ
مگر جفا کو جفا ہی سمجھ وفا نہ سمجھ

بدل بھی سکتی ہے اک آن میں رضا ہی تو ہے
رضائے دوست کو تقدیر کا لکھا نہ سمجھ

کسی کا چاند سا چہرہ اگر نگاہ میں ہے
تو اس کو چاند ہی گردان چاند سا نہ سمجھ

نئے شگوفے انھی ٹہنیوں سے پھوٹیں گے
جو ٹوٹتے ہیں انھیں شاخ سے جدا نہ سمجھ

انھی سے نغمۂ فصل بہار ابھرے گا
ملے دلے ہوئے پھولوں کو بے نوا نہ سمجھ

rekhta

میں لہو کی بوند مژگاں پر لئے پھرتا رہا
خلوتوں کی چیز کو باہر لئے پھرتا رہا

صبح کی دیوار کے سائے میں تھک کر سو گئے
چاند جن کو شہر میں شب بھر لئے پھرتا رہا

میں طلب کے اجنبی رستوں پہ پھیلی دھوپ میں
سر پہ تیرے درد کی چادر لئے پھرتا رہا

تم کہیں گھٹنوں پہ سر رکھے ہوئے بیٹھے رہے
میں کہیں آنکھوں میں خاکستر لئے پھرتا رہا

تم کہو کیا تھا تمھاری کم نمائی کا سبب
مجھ کو تو یہ پاؤں کا چکر۔ لئے پھرتا رہا

ہمسفر سارے پرانے راستوں پر آ گئے
میں نگاہوں میں نئے منظر لئے پھرتا رہا

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

جہاں کہ داغ ہے یاں آگے درد رہتا تھا
مگر یہ داغ بھی جاتا دکھائی دیتا ہے

پکارتی ہیں بھرے شہر کی گذرگاہیں
وہ روز شام کو تنہا دکھائی دیتا ہے

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

خزاں کے زرد دنوں کی سیاہ راتوں میں
کسی کا پھول سا چہرہ دکھائی دیتا ہے

کہیں ملے وہ سر راہ تو لپٹ جائیں
بس اب تو ایک ہی رستہ دکھائی دیتا ہے

rekhta

اب کے اس باغ میں وہ رنگ خزاں دیکھو گے
نہ اڑے گا کوئی شعلہ نہ دھواں دیکھو گے

اب جو اوروں پہ چمکتا ہے تو چپ رہتے ہو
اسی خنجر کو قریب رگ جاں دیکھو گے

جیسے ممکن ہو بچا لو یہ اجڑتے ہوئے شہر
پھر نہ یہ رنگ نہ چہرے نہ مکاں دیکھو گے

جانے والو ! چمن دل کی زیارت کر لو
اب کے لوٹو گے تو کچھ بھی نہ یہاں دیکھو گے

دیدنی ہے شفق شام الم کا منظر
پھر یہ بجھتے ہوئے چہرے بھی کہاں دیکھو گے

ہر لمحہ ظلمتوں کی خدائی کا وقت ہے
شاید کسی کی چہرہ نمائی کا وقت ہے

کہتی ہے ساحلوں سے یہ جاتے سمے کی دھوپ
ہشیار ! ندیوں کی چڑھائی کا وقت ہے

ہوتی ہے شام آنکھ سے آنسو رواں ہوئے
یہ وقت قیدیوں کی رہائی کا وقت ہے

کوئی بھی وقت ہو کبھی ہوتا نہیں جدا
کتنا عزیز اس کی جدائی کا وقت ہے

دل نے کہا کہ شام شب وصل سے نہ بھاگ
اب پک چکی ہے فصل کٹائی کا وقت ہے

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

خواب کے پھولوں کی تعبیریں کہانی ہوگئیں
خون ٹھنڈا پڑ گیا آنکھیں پرانی ہوگئیں

جس کا چہرہ تھا چمکتے موسموں کی آرزو
اس کی تصویریں بھی اوراق خزانی ہوگئیں

دل بھر آیا کاغذ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہوگئیں

جو مقدر تھا اسے تو روکنا بس میں نہ تھا
ان کا کیا کرتے جو باتیں ناگہانی ہوگئیں

رہ گیا مشتاق دل میں رنگ یاد رفتگاں
پھول مہنگے ہوگئے قبریں پرانی ہوگئیں

دل میں شور برابر ہے
کون اس گھر کے اندر ہے

عشق میں کوئی وقت نہیں
دن اور رات برابر ہے

دل پر کوئی بوجھ نہیں
یعنی آپ ہی پتھر ہے

باہر خوب ہنسو بولو
رونے دھونے کو گھر ہے

دکھ کی مسلیں چار طرف
دل بھی میرا دفتر ہے

ترک عشق سے جی کا حال
پہلے سے کچھ بہتر ہے

ختم ہوا سب کاروبار
یادیں ہیں اور بستر ہے

تم ہو شاد نہ میں غمگیں
یہ موسم کا چکر ہے

ساحل سے پوچھو مشتاق
کتنی دور سمندر ہے

rekhta

تم آئے ہو تمھیں بھی آزما کر دیکھ لیتا ہوں
تمھارے ساتھ بھی کچھ دور جا کر دیکھ لیتا ہوں

ہوائیں جن کی اندھی کھڑکیوں پر سر پٹکتی ہیں
میں ان کمروں میں پھر شمعیں جلا کر دیکھ لیتا ہوں

عجب کیا اس قرینے سے کوئی صورت نکل آئے
تری باتوں کو خوابوں سے ملا کر دیکھ لیتا ہوں

سحر دم کرچیاں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی ملتی ہیں
تو بستر جھاڑ کر چادر ہٹا کر دیکھ لیتا ہوں

بہت دل کو دکھاتا ہے کبھی جب درد مجبوری
تری یادوں کی جانب مسکرا کر دیکھ لیتا ہوں

rekhta

اڑا کر رنگ کچھ ہونٹوں سے کچھ آنکھوں سے کچھ دل سے
گئے لمحوں کو تصویریں بنا کر دیکھ لیتا ہوں

نہیں ہو تم بھی وہ اب مجھ سے یارو کیا چھپاؤ گے
ہوا کی سمت کو مٹی اڑا کر دیکھ لیتا ہوں

سنا ہے بے نیازی ہی علاج ناامیدی ہے
یہ نسخہ بھی کوئی دن آزما کر دیکھ لیتا ہوں

محبت مر گئی مشتاقؔ لیکن تم نہ مانو گے
میں یہ افواہ بھی تم کو سنا کر دیکھ لیتا ہوں

ہاتھ سے ناپتا ہوں درد کی گہرائی کو
یہ نیا کھیل ملا ہے مری تنہائی کو

تھا جو سینے میں چراغ دل پرخوں نہ رہا
چاٹیے بیٹھ کے اب صبر و شکیبائی کو

دل افسردہ کسی طرح بہلتا ہی نہیں
کیا کریں آپ کی اس حوصلہ افزائی کو

خیر بدنام تو پہلے بھی بہت تھے لیکن
تجھ سے ملنا تھا کہ پر لگ گئے رسوائی کو

نگہ ناز نہ ملتے ہوئے گھبرا ہم سے
ہم محبت نہیں کہنے کے شناسائی کو

دل ہے نیرنگی ایام پہ حیراں اب تک
اتنی سی بات بھی معلوم نہیں بھائی کو

rekhta

وہ چلتی تو خیالِ وصل اس کے ساتھ چلتا تھا
نظر اٹھتی کسی پر، اور رنگ اس کا بدلتا تھا

وہ اٹھتی تو ہوا اس کے کھلے بالوں میں چلتی تھی
کبھی بادل امڈتے تھے کبھی سورج نکلتا تھا

اسے کل راستے میں دیکھ کر حیرت ہوئی مجھ کو
یہی لو تھی کبھی جس سے چراغِ عشق جلتا تھا

rekhta

ورق الٹ رہا ہوں مدتوں پرانی بات کے
جھڑی لگی ہوئی ہے اور دس بجے ہیں رات کے

نحیف کھڑکیوں سے دور کس ہوا کا شور ہے
کہ پھڑ پھڑا رہے ہیں پر پرانے واقعات کے

میں راستے میں کوئلوں کی راکھ دیکھتا رہا
اگرچہ دور بھی نہ تھے نشاں تری برات کے

نہیں کہ صبح تلک اس کی راہ تکتے رہو
اسے بھی یاد کرو آنکھ بھی جھپکتے رہو

عجب نہیں جو وہ نام و نشاں ہی بتلا دے
کبھی ملو بھی اسے دور سے نہ تکتے رہو

ستم گزیدو کوئی ہاؤ ہو کوئی فریاد
جو یہ نہیں ہے تو مرتے رہو سسکتے رہو

حیران ہوں سحر کے نظارے کو دیکھ کر
روتا ہے پھول صبح کے تارے کو دیکھ کر

کل دیکھنا کہ بحر فنا میں اتر گئے
چلتا ہے وقت جن کے اشارے کو دیکھ کر

rekhta

خبر نہیں تری آنکھوں کے اس طرف کیا ہے
سمندروں کے کنارے نظر نہیں آتے

نکل کے دیکھ طلوع و غروب حسن کے رنگ
کہ روز روز یہ شام و سحر نہیں آتے

rekhta

میں تجھے بھول نہ جاتا تو خزاں ہی رہتی
شاخ پر پھول تری یاد دلانے آیا

آخر اس کو مری آنکھوں کی کشش لے آئی
وہ کسی اور سے ملنے کے بہانے آیا

rekhta

روئے تھے ہم پچھلے ساون میں
لمبی گھاس اُگی آنگن میں

پھولو اس کا نام نہ پوچھو
کانٹے ہیں اپنے دامن میں

rekhta

کیسے اس ہجر کی بستی میں گزارہ ہوگا
پانی اچھا ہے یہاں کا نہ ہوا اچھی ہے

جیسی اس وقت ہے اس طرح کی تاریکی میں
شمع افسردہ بھی اے شعلہ نوا اچھی ہے

rekhta

یہ مٹی جس پہ سورج ناچتا ہے
جنھیں معلوم ہے وہ چھانتے ہیں

یہ آبادی جہاں بادل نہ پانی
یہاں کچھ لوگ مجھ کو جانتے ہیں

rekhta

اشعار

خالی شاخیں بلا رہی ہیں
پھولو آؤ کہاں گئے ہو

مند نے لگی جب آنکھ ہوائے بہار سے
لے منہ پہ چاندنی کی ردا سو گیا کوئی

خزاں کی یادیں بہار بن بھی گئیں تو اب چپ رہا کریں گے
بہت ہوا تو کوئی ہری شاخ دیکھ کر رو دیا کریں گے

آواز نہ زمزمہ نہ پرواز
چپ چاپ بھری بہار گذری

جو اپنے خشک لبوں سے گذر گئی چپ چاپ
اسی نوا سے دلوں کو گداز ہم نے کیا

دیدۂ نرم و دل گرم سے ہے جو کچھ ہے
شوق آوارگی و ذوق ادب کچھ بھی نہیں

فٹ پاتھ کی دیوار سے چمٹے ہوئے پتے
اک شام ہواؤں کو درختوں پہ ملے تھے

بس ہمیں چھاؤں درختوں کی بھلی لگتی ہے
بس یونہی گھومتے رہتے ہیں سبب کچھ بھی نہیں

مشتاق کسی کے روٹھنے کا
غم بھی ہے مگر خوشی بہت ہے

شفق کی عمارت میں سب لگ گیا
جوانی کے پہلے دنوں کا لہو

وہ کس خیال میں ان راستوں پہ شام ڈھلے
طلوع صبح سی گردن جھکا کے چلتا ہے

پھولوں کے ہاتھ دے کے زمینوں کا انتظام
تارے تمام لوٹ گئے شام کی طرف

بات تو جب ہے کہ دل کا رنگ بھی تبدیل ہو
پھول کھلنے سے نہ آتی ہے نہ جاتی ہے بہار

حویلی کی دیوار سونی سپید
مگر حرف دیوار لا تقنطوا

اب راہ طلب اور بھی دشوار ہوئی ہے
اب سوچ سمجھ کر کوئی دیوانہ بنے گا

کوئی ہو معالج چشم نم مرے دل کا بوجھ اتار دے
مرے سارے کام بگاڑ دے مرا ایک کام سنوار دے

مجھے اب بھی یاد ہے خواب سا گل شام ہجر کھلا ہوا
کوئی ہے جو داغ وصال سے مری آستیں کو جدا کرے

رہا ہے ناؤ کا تختہ نہ کوئی لہر کا رنگ
مگر وہ سبزۂ خودرو کنار دریا کا

کہاں اتنا دم کہ ہوائے غم مرے سب چراغ بجھا سکے
کبھی کوئی پھول کھلا رہا کبھی کوئی شاخ ہری رہی

گرد مہتاب

پہلی بار : فروری ۱۹۸۱
ناشر : حسن سلطان
مکتبۂ خیال، لاہور
مطبع : منظور پرنٹنگ پریس

فرخندہ، آفاق اور اعتزاز

کے نام

نیند آتی نہیں تو صبح تلک
گردِ مہتاب کا سفر دیکھو

ناصر کاظمی

rekhta

پیش لفظ

جب اس پری پیکر کے سامنے رہتے رہتے دن گذرے تو شہزادے کو خیال آیا کہ اس کا کچھ اتا پتا تو لینا چاہئے۔ پوچھا کہ اے مہ لقا کچھ بتا کہ تو کون ہے، تیرا نام کیا ہے۔ اس نے کہا کہ مت پوچھ، پچھتائے گا۔ اس نے کہا ضرور پوچھوں گا۔ نام بتانے سے اس نازنین نے جتنا انکار کیا اتنا ہی شہزادے نے اصرار کیا۔ اس کا اصرار دیکھ وہ پری لوٹ پوٹ ہوئی اور فاختہ بن کر اڑ گئی۔ شہزادہ اپنی ضد پر پچھتایا اور ہاتھ ملنے لگا۔

میں نے تو پرانی کہانیوں کو سیدھی سچی کہانیوں کے طور پر سنا اور پڑھا ہے۔ مگر اب سننے میں یہ آ رہا ہے کہ ان کہانیوں کا ایک علامتی مفہوم ہوتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس کہانی کا کوئی علامتی مفہوم اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ کوئی کوئی شاعری بالکل اسی قماش کی ہوتی ہے۔ احمد مشتاق کے شعر میں کب سے پڑھ رہا ہوں۔ مگر عجب شاعری ہے۔ اپنا نام نہیں بتاتی۔

احمد مشتاق کے تجربے سے مجھے یہ پتہ چلا کہ نظریاتی شاعری بہت شریفانہ شاعری ہوتی ہے۔ چھوٹتے ہی اپنا نام بتا دیتی ہے۔ اس میں سب ہی فریقوں کو سہولت رہتی ہے۔ شاعر کو شعر کہنے میں، نقاد کو تنقید کرنے میں، قاری کو سمجھنے میں، دانشور کو چائے کی میز پر بات کرنے میں۔ اسی لئے اس ڈھب کی شاعری جلدی قبول ہو جاتی ہے مگر مزہ یہ ہے کہ جلدی فراموش بھی ہو جاتی ہے۔

مشتاق کی شاعری کے بارے میں اتنا تو میں آسانی سے بتا سکتا ہوں کہ اس میں کس کس چیز کی کمی ہے۔ ایک بات تو یہی ہے کہ اس میں نظریئے کی سخت کمی ہے۔ سماجی

Rekhta

قومی تقاضے پورے کرنے کی لگن بھی نہیں ملتی۔ ایسی
یزوں کی کمی ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ یہ سب کچھ اس کے
ہ کی میز کے صرفے میں آجاتا ہے۔ شاعری کی
ل ہوتا ہے۔

اق کی غزل روایتی غزل ہے یا نئی غزل کے ذیل
نے بہت شروع میں اپنی ایک غزل میں فٹ پاتھ
نے اسے خوب داد دی کہ تم نے تغزل سے بغاوت
۔ پتہ نہیں مشتاق کیوں اس روش سے بدک گیا
پکڑا۔ اسی کے پیٹ سے وہ غزل پیدا ہوئی جسے
اس نئی غزل کو دیکھ کر مجھے میرا جی اور راشد سے
شاعر کسی سائنسی ایجاد مثلاً ریل گاڑی یا ہوائی
ستا تھا کہ نئی زندگی سے اس کی شاعری کا رشتہ
ا بنانے کے اس طریقہ کی حقیقت کو پہچان لیا
یکھ کر بھاگ کھڑا ہوا ہو۔ کیوں کہ ہے تو آدمی

ہ کہ مشتاق نے شاعری کے معروف و مقبول
ری سے ایسے نشانات گم ہیں جن سے کوئی
یا کوئی سماجی، سیاسی، اقتصادی شعور کشید کیا
اجاتا ہے۔ مشتاق کو پکڑنا اسی لئے مشکل
ہ نہیں دی ہے۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ آدمی
ہے مثلاً یہ غزلیں پڑھتے ہوئے مجھے ایک
کا ذکر کیوں آتا ہے، میرا دھیان پیچھے کی
ے اپنے ساتھ ملا کر ایک ٹیبل ٹاک کر ڈالی

غالب کے خلاف رواں ہونے کے بعد اس نے مشتاق کا یہ شعر پڑھا۔

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

اور کہا کہ اس کا رشتہ تھیل کے فلسفہ سے ملتا ہے اس پر کراچی سے لاہور تک ادبی حلقوں میں بہت اودھم مچا اور بہت پھبتیاں ہوئیں۔ خیر میں اس بات کو آگے نہیں بڑھاؤں گا کہ فلسفوں سے میری آشنائی نہیں۔ مگر یہ خیال تو آتا ہی ہے کہ آخر اس وقت سے اب تک مشتاق کی غزل میں دریا کیوں آئے چلا جا رہا ہے۔ میں نقاد ہوتا تو کہتا کہ دریا مشتاق کے یہاں فلاں چیز کا استعارہ ہے۔ مثلاً وقت کا۔ مگر نقاد تو ایسا بیان دینے کے بعد جوڑ سے جوڑ ملاتا ہے۔ میرے بس کی تو یہ بات نہیں۔ اور دریاؤں کے ساتھ تو یوں بھی میں ایسے سلوک کو روا نہیں سمجھوں گا۔ میں تو دریا کو دریا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ دریا رہتے ہوئے وہ اگر کہیں کہیں وقت کا استعارہ بنتا نظر آئے تو خیر اس میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے یہ مجھے اندازہ ہے کہ وقت مشتاق کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے یہاں بنیادی مسئلہ ہی یہ ہے۔ ان غزلوں میں گذرتے وقت کا احساس کتنی اذیت ناکی سے ابھرتا ہے۔

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی پرواز تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا
لوٹا ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا

اور اگر کوئی ملتا بھی ہے تو وقت کے ہاتھوں کیا سے کیا ہو چکا ہے۔

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

اچھا وقت کا احساس تو ہوا۔ مگر وقت کے ساتھ یہ مکان کا کیا چکر ہے۔ مکان کا ذکر بھی مشتاق کے یہاں بہت آتا ہے اور یہ ذکر دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ مشتاق اپنی شاعری میں کسی لمبی مار پر نہیں ہے۔ یوں دیکھئے کہ ان غزلوں میں مکان کا ذکر بار بار آتا ہے، کائنات کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ احمد مشتاق کے پاس جس طرح کوئی

نظریہ حیات نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی تصور کائنات بھی نہیں ہے۔ اس کی کائنات مکان ہے بس اس کے واسطے سے وقت کے عمل کو جاننے سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

سونے دالان کھڑکیاں سنسان
خالی کمرے مکان کے دیکھے
جس کی سانسوں سے مہکتے تھے درو بام ترے
اے مکاں بول کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

مکان مشتاق کے یہاں کوئی تجرید نہیں ہے، اس کی استعاراتی حیثیت ہوگی، مگر یہ بعد کی بات ہے۔ اولاً وہ سیدھے سچے مکان ہیں، برجیوں والے مکان، کھڑکیوں اور دالانوں والے مکان۔ کوئی درختوں کی اوٹ میں اپنی نیچی چھت کے ساتھ کھڑا ہوا، کوئی اپنی برجیوں کے ساتھ گلی کے بیچ کھڑا ہوا۔ اصل میں ان غزلوں میں پورے ایک شہر کا نقشہ ابھرتا ہے۔ دور سے دیکھو تو اس کی صرف برجیاں نظر آئیں گی۔ قریب آیئے اور دیکھئے کہ یہاں گلیوں کا ایک جال بچھا ہے اور چھوٹے بڑے مکان کھڑے ہیں۔ ویسے تو یہاں بھی ساری توجہ اسی مکان پر ہے جو غزل میں ہمیشہ سے مرجع عاشقاں رہا ہے۔ مگر وہاں مکان کے اندر کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا، بام نظر آتی تھی یا ڈیوڑھی۔ یہاں کمرے کا بہت ذکر ہے بس اس ایک بات سے پتہ چلتا ہے کہ اس غزل میں وقت بدل چکا ہے۔ وہ اور وقت اور تہذیب تھی جب محبوب کو بالائے بام ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ سو غزل میں سارے مضمون بام پر صرف ہو گئے اب اور وقت اور تہذیب ہے۔ مشتاق غزل کو بام سے اتار کر کمرے میں لے آیا ہے۔ اور ہاں گلی جس کا ذکر غزل میں بہت رہا ہے۔ مگر وہ گلی سے زیادہ گلی کی تجرید ہے۔ مشتاق کے یہاں گلی جیتی سانس لیتی نظر آتی ہے۔ لیجئے کیا شعر یاد آیا۔

اب رات تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجب سا لگا تھا

میں اس شعر کو پڑھتے ہوئے غزل کی دنیا سے نکلتا ہوں اور چیخوف کی طرف چل پڑتا ہوں۔ جیسے میں غزل نہیں پڑھ رہا ہوں، چیخوف کی کوئی کہانی پڑھ رہا ہوں مگر چیخوف والے لہجہ کے ساتھ بڑی قباحتیں ہیں۔ یہ لہجہ لکھنے والے کو عہد کا نقیب نہیں بننے دیتا، کوئی علم

نہیں اٹھانے دیتا۔ یہاں اونچی آواز سے بولنا ہی منع ہے۔ لیجئے مجھے ایک شعر اور یاد آ گیا۔

بہت رک رک کے چلتی ہے ہوا خالی مکانوں میں
بجھے ٹکڑے پڑے ہیں سگرٹوں کے راکھ دانوں میں

اس قبیل کے شعروں کو پڑھتے ہوئے مجھے کچھ اس قسم کی بات سمجھ میں آئی کہ مشتاق کہانی کو وہاں سے پکڑتا ہے جہاں وہ ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ عمل کا شاعر نہیں ہے۔ عمل کے انجام کا شاعر ہے۔ نہ کوئی تبصرہ نہ کوئی محاکمہ۔ نہ نالہ و شیون۔ بات بالعموم ایک آہ سرد پر ختم ہو جاتی ہے ع

کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

یا زیادہ سے زیادہ ایک قسم کی افسردگی آمیز بے تعلقی پر۔

موسم گل ہو کہ پت جھڑ ہو بلا سے اپنی
ہم کہ شامل ہیں نہ کھلنے میں نہ مرجھانے میں

بس کبھی کبھی ایک پھریری سی آتی ہے۔

کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی راکھ میں
ہم نفسان شعلہ خو آگ نئی جلایئے

مگر یہ پچھلے برس کا کیا قصہ ہے۔ مشتاق پچھلے برس کی بات بہت کرتا ہے، یہ نہیں بتاتا کہ پچھلے برس ہوا کیا تھا۔ یہی تو اس شاعر کے ساتھ دقت ہے پوری بات نہیں بتاتا۔ اشارے کر کے چپ ہو جاتا ہے۔ چلئے میں اب چیخوف کو درمیان میں نہیں لاؤں گا ورنہ خواہ مخواہ گمان ہوگا کہ میں اردو غزل میں کسی چیخوف کی تلاش میں نکلا ہوں۔ مجھے اپنی غزل میں چیخوف کو تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں میر پہلے سے موجود ہے لیکن اگر میر کے یہاں کھلم کھلا بات کرنا اور اعلان کرنا منع ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تہذیب ہی اس مزاج کی تھی کہ اس میں جذبے کا کھلا اظہار معیوب سمجھا جاتا تھا اور اونچی آواز سے بولنا خلاف شائستگی جانا جاتا تھا۔ پھر اس تہذیب کے اندر میر کی اپنی تہذیب تھی جیسے اس شخص نے اس تہذیب کا سارا عطر اپنی ذات میں سمیٹ لیا ہو۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مگر یہ ادب بھی عشق سے اکیلے میر ہی نے سیکھا تھا ورنہ اس تہذیب میں عاشق اور شاعر اور بھی موجود تھے۔ اب میں مشتاق کے شعر پڑھتا ہوں۔

ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو

وہ سو رہا ہو اور اسے دیکھتا رہوں
مشتاق چاہتی ہے طبیعت کبھی کبھی

میر سے ملے بن یہ ادب نہیں آتا کہ دور سے محبوب کو سوچ میں گم دیکھے اور دبے پاؤں پلٹ آئے یا اسے سوتا ہوا پائے اور بس دیکھتا رہے۔ مشتاق کے یہاں عاشق اتنا ہی مہذب نظر آتا ہے جتنا میر کے یہاں ہے۔ یہ عاشق اپنی تمنا میں مگن نظر آتا ہے، اظہار تمنا سے دور ہے۔ کیوں؟ مہذب عاشق جو ہوا۔

تنہائی میں کرنی تو ہے اک بات کسی سے
لیکن وہ کسی وقت اکیلا نہیں ہوتا

فرض کیجئے وہ اکیلا مل جاتا ہے اور اظہار تمنا بھی ہو جاتا ہے۔ پھر؟ پھر یہی کہ

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

بیچارہ مہذب عاشق۔ اس نے کس رکھ رکھاؤ سے کس شائستگی سے اظہار تمنا کیا۔ ادھر سے جواب کیا آیا جیسے کوئی ڈلا مار دے۔ یہ نئے زمانے کا محبوب ہے۔ عاشق کوٹر خانے کے اس نے بہانے سیکھ لئے ہیں۔ عشق کی تہذیب پرانی ہے۔ محبوبوں کے ناز و انداز زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مشتاق کا زور عشق کی تہذیب پر ہے، محبوب کی سیاست پر نہیں۔ اس تہذیب کے اپنے آداب ہیں۔ یہ اعلانات کا زمانہ ہے، جذبوں کو اچھالنے کا زمانہ ہے، کم ظرف عاشقوں اور اوچھی محبوباؤں کا زمانہ ہے۔ مگر مشتاق کے یہاں عشق کے ادب آداب اور ہیں۔

اس لئے حال دل نہیں کہتا
کہیں جذبات میں نہ بہہ جاؤں

کچھ اپنے رنج اپنی مسرت بچا کے رکھ
پڑتی ہے آدمی کو ضرورت کبھی کبھی

مشتاق بہت کفایت شعار آدمی ہے۔ رنج اور مسرت دونوں کو بہت بچا بچا کر رکھتا ہے۔ جذبے کو سنبھال کر رکھنا اس جذباتی فضول خرچی کے دور میں کوئی مشتاق سے سیکھے۔ ہمارے زمانے میں شاعری کے ساتھ یہی تو سانحہ گذرا ہے کہ شاعر جلدی بہہ نکلتا ہے۔ نتیجہ جذباتیت۔ اس صدی کی تیسری دہائی کی ترقی پسند شاعری اور افسانہ اس کی عبرت بھری مثالیں ہیں۔ اس کم ظرف زمانے میں مشتاق کی طاقت یہ ہے کہ اسے اپنے آپ کو تھام کر رکھنا آتا ہے۔ جذبے کو سنبھالنا، تخلیقی طور پر اس کی پرورش کرنا، تہذیب کرنا اسے خوب آتا ہے۔ سو اس کے یہاں زور جذبے کے اعلان پر نہیں بلکہ جذبے کے ضبط پر ہے۔ جذباتیت کے اس دور میں مشتاق کی غزل جذبے کی شاعری کی مثال پیش کرتی ہے۔ خالص جذبے کی شاعری۔ کہہ لیجئے خالص شاعری۔

غالب کا استدلال یہ تھا کہ لطافت بے ثقافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ مشتاق کو دھن یہ ہے کہ لطافت سے ثقافت یکسر خارج کر دی جائے۔ وہ چیزوں کو پاک صاف دیکھنا چاہتا ہے ع

کتنے نفیس تھے مکاں صاف تھا کتنا آسماں

مگر اب آسمان کو کیا ہو گیا، ع

دھوئیں سے آسماں کا رنگ میلا ہوتا جاتا ہے

زمین کا یہاں ذکر نہیں۔ یہ تو پہلے ہی میلی ہو چکی تھی۔ آسمان رہ گیا تھا۔ سو زمین سے اٹھتا دھواں اب اسے بھی میلا کئے دے رہا ہے اور اب میری سمجھ میں کچھ کچھ آرہا ہے کہ مشتاق کے یہاں دریا کا ذکر بار بار کیوں آتا ہے۔ چیزوں کو پاک وصاف دیکھنے کی خواہش نے دریا میں اس کے لئے اتنی کشش اتنی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ اس زمین پر آب رواں سے زیادہ پاک وصاف شے کون سی ہو سکتی ہے۔ رہ گئے آدمی تو

بہت شفاف تھے جب تک کہ مصروف تمنا تھے
مگر اس کار دنیا میں بڑے دھبے لگے ہم کو

زندگی میں اس شخص کا رویہ یہ ہے کہ اسے ہر آدمی تمنا سے دور اور کار دنیا میں ملوث نظر آتا ہے۔ دشمن کی نظر جوتے پر اور احمد مشتاق کی نظر دوستوں کے دامن پر۔ ہر دامن پر وہ کوئی دھبہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اپنے دامن کو دھبے سے بچانے کا اس نے یہ طریقہ سوچا کہ گھر سے دفتر، دفتر سے ٹی ہاؤس۔ ٹی ہاؤس سے قدم باہر مت نکالو، مبادا کہ تم کار دنیا میں ملوث ہو جاؤ اور دامن پر دھبہ آجائے۔ اس رویے کو لے کر جب وہ شاعری میں آیا تو اس نے ایسی شاعری کرنے کی کوشش کی جس کا خمیر تمنا سے اٹھا ہو۔ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں، شاعری پیدا کرنے کا یہ نسخہ اس کے مطلب کا نہیں تھا۔ غم جاناں اور صرف غم جاناں کے یہ غم صفائے قلب کا ضامن ہے۔

مگر بات یہاں آکر ختم نہیں ہو جاتی۔ مشتاق نے زندگی میں کار دنیا سے تو بے شک اپنے آپ کو دور رکھا۔ مگر غم دوراں تو اس کے یہاں وافر مقدار میں موجود ہے۔ شاعری کی اقلیم میں داخل ہوتے ہوئے اس کا کیا بندوبست کیا جائے مگر بندوبست کہاں تک کیا جاسکتا ہے۔ بندہ بشر ہے۔ بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ مشتاق کے دامن پر ممکن ہے کہ کوئی دھبہ نہ ہو مگر شاعری میں تو اس سے بھول چوک ہوئی ہے اور کبھی کبھار ایسا شعر بھی اس میں نظر آجاتا ہے۔

تبدیلی حالات کے چرچے تو بہت ہیں
لیکن وہی حالات کی صورت ہے ابھی تک

مگر اکا دکا ایسا شعر صرف اتنا ظاہر کرتا ہے کہ مشتاق سے کبھی کبھی غفلت بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے اس کا بندوبست بہت سخت ہے۔ بندوبست یہ ہے کہ غم دوراں اگر اس کے شعر کی اقلیم میں آتا ہے تو اس پر پابندی یہ ہوگی کہ وہ غم جاناں کی تابعداری قبول کرے۔ اور مشتاق اپنے غم دوراں سے غم جاناں کی اتنی تابعداری کراتا ہے کہ اس کی اپنی خود مختار حیثیت ختم ہو جاتی ہے، بس وہ غم جاناں کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس سے غم جاناں کو بے شک فائدہ پہنچتا ہے کہ اس اثر سے اس میں ایک نئی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر غم دوراں اس طرح تحلیل ہوتا ہے کہ اسے اس شاعری میں پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس قسم کے شعر میں کہ۔

موسموں کا کوئی محرم ہو تو اس سے پوچھوں
کتنے پت جھڑ ابھی باقی ہیں بہار آنے میں

آسانی سے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اپنے عہد کا وہ کیا احوال ہے یا ہماری اجتماعی زندگی کا وہ کیا نقشہ ہے جو بھیس بدل کر یہاں ظاہر ہوا ہے۔ یا سچی کھری عشقیہ غزل کے بیچ کوئی ایسا شعر بھی آ جائے۔

کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی راکھ میں
ہم نفسانِ شعلہ خو آگ نئی جلایئے

تو وہ باقی غزل سے ہٹ کر اپنے معنی کا اعلان نہیں کرے گا۔ میں تو اس وجہ سے ٹھٹکا کہ میں کسی پچھلے برس میں مشتاق کا یہ شعر پڑھ چکا تھا۔

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

اور اب پھر مجھے خیال آ رہا ہے کہ معلوم کیا جائے کہ یہ پچھلا برس آخر کون سا برس ہے اور مشتاق کی شاعری میں کیا کر رہا ہے۔ موسموں کے اس قدر ذکر کی بات تو میری سمجھ میں کسی قدر آتی ہے صفائی اور پاکیزگی کی جسے تلاش ہے وہ فطرت کی طرف جائے ہی جائے۔ ہوا، پانی، بادل، آسمان، گل پھول، درخت، پرندے، اان غزلوں میں پاکیزگی انھی واسطوں سے اپنے درشن دیتی ہے اور گذرتا وقت بھی انھی واسطوں سے اپنا اعلان کرتا ہے۔ شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص یہ دقت چلی آتی ہے کہ اشیا اپنی شیئیت کو برقرار نہیں رکھ پاتیں۔ اشیا اپنی شیئیت کو کم کر کے تجریدی رنگ پکڑ لیتی ہیں اور مظاہر فطرت اپنی مہک کھو کر استعاروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی دقت اب علامت نگاری کی بدولت افسانے میں پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اگر لکھنے والے کی طرف سے کسر رہ جاتی ہے تو اسے نقاد پوری کر دیتے ہیں۔ نقاد شیئیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ وہ ادب میں شے کو شے کے طور پر قبول ہی نہیں کرتے جیسے شے ہونا کوئی چھوٹی بات ہے۔ ہر شے ہر مظہر کو اپنے تجزیئے اور تعبیر کے زور سے علامت ثابت کرتے ہیں اور پھر اس پر داد دیتے ہیں۔ میں مشتاق کے سلسلہ میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ اس شاعری میں مجھے بادل،

آسمان، دریا، اولاً اپنی ساری شادابی اور پاکیزگی کے ساتھ بادل، آسمان اور دریا ہی نظر آتے ہیں اگر استعاراتی رنگ پکڑتے ہیں تو دوسری سطح پر جا کر۔ استعارہ بننے کے شوق میں وہ اپنی سطح کو گم نہیں کرتے ع

کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

اس مصرع کے ساتھ میرے تصور میں سچ مچ کے پرندے اور سچ مچ کے گھونسلے ابھرتے ہیں۔ گھونسلے جو پچھلے موسم میں اپنے مکینوں کے ساتھ کتنے زندہ اور حرارت بھرے نظر آتے تھے اور اب شاخ شاخ مردہ سے لٹکے ہوئے ہیں، بے آباد بے حرارت۔ میرے لئے تو اتنا کافی ہے۔ اس میں علامتی رنگ آپ خود ڈھونڈ لیجئے

یہ پانی خامشی سے بہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

اس میں فلسفے کی بات ناصر کاظمی جانیں۔ میرے لئے یہ خالص پانی ہے۔

ویسے ناصر کو غالب سے شکایت کیا تھی؟ یہی کہ اس شخص نے اشیا کو اشیا کے طور پر قبول نہیں کیا۔ غزل کا یہ شیوہ ہی نہیں رہا۔ اس کا اثر نئی نظم پر بھی پڑا کہ اشیا سے وہ بھی خائف ہے، انھیں استعارے کا جامہ پہنا لیتی ہے تب اپناتی ہے۔ ہمارے زمانے میں غزل میں اس سے انحراف ناصر نے کیا تھا یا مشتاق نے کیا ہے اور صحیح کیا۔ آخر غزل کو موسموں کا کیوں پتہ نہ چلے۔ کیوں یہ خبر نہ ہو کہ جاڑے کی رت کیسے آتی ہے اور برکھا رت کیا کرتی ہے۔ آسمان بیضۂ قمری بھی نظر آ سکتا ہے اور بیضۂ مور بھی۔ مگر اسے آسمان بھی تو نظر آنا چاہئے۔ مشتاق کے یہاں آسمان آسمان ہے اور موسم سچ مچ کے موسم ہیں ع

گرمیاں سردیاں بہار خزاں

جب ہی تو میں مشتاق کی غزل کو خالی غزل سمجھ کر نہیں پڑھتا۔ کیا سمجھ کر پڑھتا ہوں، اس پر سوچنا پڑے گا۔

انتظار حسین
۵ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ

یہ ہم غزل میں جو حرف و بیاں بناتے ہیں
ہوائے غم کے لئے کھڑکیاں بناتے ہیں

انھیں بھی دیکھ کبھی اے نگار شام بہار
جو ایک رنگ سے تصویر جاں بناتے ہیں

نگاہ ناز کچھ ان کی بھی ہے خبر تجھ کو
جو دھوپ میں ہیں مگر بدلیاں بناتے ہیں

ہمارا کیا ہے جو ہوتا ہے جی اداس بہت
تو گل تراشتے ہیں تتلیاں بناتے ہیں

کسی طرح نہیں جاتی فسردگی دل کی
تو زرد رنگ کا اک آسماں بناتے ہیں

دل ستم زدہ کیا ہے لہو کی بوند تو ہے
اس ایک بوند کو ہم بیکراں بناتے ہیں

بلا کی دھوپ تھی دن بھر تو سائے بنتے تھے
اندھیری رات ہے چنگاریاں بناتے ہیں

ہنر کی بات جو پوچھو تو مختصر یہ ہے
کشید کرتے ہیں آگ اور دھواں بناتے ہیں

rekhta

خون دل سے کشت غم کو سینچتا رہتا ہوں میں
خالی کاغذ پر لکیریں کھینچتا رہتا ہوں میں

آج سے مجھ پر مکمل ہو گیا دین فراق
ہاں تصور میں بھی اب تجھ سے جدا رہتا ہوں میں

تو دیار حسن ہے، اونچی رہے تیری فصیل
میں ہوں دروازہ محبت کا، کھلا رہتا ہوں میں

شام تک کھینچے لئے پھرتے ہیں اس دنیا کے کام
صبح تک فرش ندامت پر پڑا رہتا ہوں میں

ہاں کبھی مجھ پر بھی ہو جاتا ہے موسم کا اثر
ہاں کسی دن نا شناسِ آب و ہوا رہتا ہوں میں

اہل دنیا سے تعلق قطع ہوتا ہی نہیں
بھول جانے پر بھی صورت آشنا رہتا ہوں میں

rekhta

اب نہ بہل سکے گا دل اب نہ دیئے جلایئے
عشق و ہوس ہیں سب فریب آپ سے کیا چھپایئے

اس نے کہا کہ یاد ہیں رنگ طلوع عشق کے؟
میں نے کہا کہ چھوڑیئے اب انھیں بھول جایئے

کیسے نفیس تھے مکاں صاف تھا کتنا آسماں
میں نے کہا کہ وہ سماں آج کہاں سے لایئے

کچھ تو سراغ مل سکے موسم درد ہجر کا
سنگ جمال یار پر نقش کوئی بنایئے

کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی راکھ میں
ہم نفسان شعلہ خو آگ نئی جلایئے

میٹھی نیند میں آئیں گے سپنے نئے جہان کے
ہجر کی ٹھنڈی رات میں سو جا چادر تان کے

ہر موسم کے پھول سے سجی تھی خواب کی کارنس
آنکھ کھلی تو فرش پر ٹکڑے تھے گلدان کے

شہر تو کب کا مٹ چکا لیکن اب تک یاد ہیں
کسی مکان کی جالیاں شیشے کسی مکان کے

نئے ہیں اب تک دو ورق یاد کی پھٹی کتاب میں
نرم عبارت آنکھ کی جملے دبی زبان کے

دل کے اندر دیر سے موسم تھا برسات کا
آخر دھندلے پڑ گئے نقش تری پہچان کے

rekhta

خیر اوروں نے بھی چاہا تو ہے تجھ سا ہونا
یہ الگ بات کہ ممکن نہیں ایسا ہونا

دیکھتا اور نہ ٹھہرتا تو کوئی بات بھی تھی
جس نے دیکھا ہی نہیں اس سے خفا کیا ہونا

تجھ سے دوری میں بھی خوش رہتا ہوں پہلے کی طرح
بس کسی وقت برا لگتا ہے تنہا ہونا

یوں میری یاد میں محفوظ ہیں تیرے خد وخال
جس طرح دل میں کسی شے کی تمنا ہونا

زندگی معرکۂ روح و بدن ہے مشتاق
عشق کے ساتھ ضروری ہے ہوس کا ہونا

دنیا میں سراغ رہ دنیا نہیں ملتا
دریا میں اتر جائیں تو دریا نہیں ملتا

باقی تو مکمل ہے تمنا کی عمارت
اک گذرے ہوئے وقت کا شیشہ نہیں ملتا

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا
لوٹا ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا

جو دل میں سمائے تھے وہ اب شامل دل ہیں
اس آئینے میں عکس کسی کا نہیں ملتا

تو نے ہی تو چاہا تھا کہ ملتا رہوں تجھ سے
تیری یہی مرضی ہے تو اچھا نہیں ملتا

دل میں تو دھڑکنے کی صدا بھی نہیں مشتاق
رستے میں ہے وہ بھیڑ کہ رستہ نہیں ملتا

rekhta

میں نے اپنے آپ سے دھوکا کیا
تم نے اپنی خواہشوں کا کیا کیا

جگمگاتے آسمانوں سے پرے
ایک بادل دیر تک برسا کیا

راستوں پر گھاس لمبی ہو گئی
دل کی باتوں نے بہت رسوا کیا

لگ گئے لوگ اپنے اپنے کام سے
اور میں تیرا پتہ پوچھا کیا

rekhta

میں نے جو سوچا تھا غارت ہو گیا
تم نے جو چاہا اسے پورا کیا

خود لکھا خود ہی مٹا ڈالا اسے
اب کوئی پوچھے کہ کیوں ایسا کیا

خواب سارے ریزہ ریزہ کر دیے
جاگنے والے نے کیا اچھا کیا

rekhta

یہ نقش محبت ہے دوبارہ نہ بنے گا
چاہو بھی تو اس طرح کا نقشہ نہ بنے گا

کب لفظ محبت کی سیاہی کو خبر تھی
یہ لفظ چراغ دل پروانہ بنے گا

اس آگ نے کچھ روز تماشا تو دکھایا
اب آگ لگے گی تو تماشا نہ بنے گا

ہاں رنگ خزاں کو بھی ترس جائیں گی آنکھیں
ہاں اہل چمن اب یہاں ویرانہ بنے گا

اب راہ طلب اور بھی دشوار ہوئی ہے
اب سوچ سمجھ کر کوئی دیوانہ بنے گا

کیوں چھوڑ گیا مجھے ترستا
بادل تھا تو دو گھڑی برستا

مر تو نہیں جائیں گے مگر ہاں
کچھ روز رہیں گے دل شکستہ

صحرائے ہوس میں کھو گیا ہوں
اے عشق نکال کوئی رستہ

مہنگی ہیں یہاں تمام چیزیں
بس خون ہے آدمی کا سستا

rekhta

یوں خلق خدا جئے گی کب تک
بندہ بھی تو بن خدا پرستا

سیکھا ہے جو زندگی سے میں نے
کہتا پھرتا تو گھر نہ بستا

وہ چھوڑ گیا ہے مجھ کو مشتاق
دریا نے بدل لیا ہے رستہ

rekhta

بظاہر تو بکھرتے جا رہے ہیں
مگر اندر سے ڈرتے جا رہے ہیں

جنھیں جینا ہے وہ جیتے رہیں گے
جنھیں مرنا ہے مرتے جا رہے ہیں

توانائی تھی جن کی قابل رشک
وہ رستے میں بکھرتے جا رہے ہیں

نئی بیلیں بنا اے ناخن شوق
پرانے زخم بھرتے جا رہے ہیں

بدلتے موسمو ! غافل نہیں ہم
ہم اپنا کام کرتے جا رہے ہیں

کبھی جن پر توجہ ہی نہیں دی
وہی دل میں اترتے جا رہے ہیں

زلفیں پکارتی ہیں پریشاں کہاں گئے
آئینے پوچھتے ہیں وہ حیراں کہاں گئے

شائستۂ فراق یہاں اب کوئی نہیں
تھی جن سے عزت شب ہجراں کہاں گئے

جن کا وجود تھا سر و سامان زندگی
اے زندگی وہ بے سر و ساماں کہاں گئے

تھی جن کو آرزو کوئی انساں دکھائی دے
دنیا تجھے خبر ہے وہ انساں کہاں گئے؟

آنکھیں کھلی تو دھوپ چمکتی ہوئی ملی
میرے طلوع صبح کے ارماں کہاں گئے

تم ملے بھی تو ملاقات نہ ہونے پائی
شام آئی تھی مگر رات نہ ہونے پائی

ان کہی بات نے اک حشر اٹھا رکھا تھا
شور اتنا تھا کوئی بات نہ ہونے پائی

درد نے سیکھ لیا اپنی حدوں میں رہنا
خواہش وصل مناجات نہ ہونے پائی

کون سے وہم کے پردے تھے دلوں میں حائل
کیوں تری ذات مری ذات نہ ہونے پائی

دل ہی آمادۂ صحرا ہو تو کیوں کر کہیے
زندگی باغ طلسمات نہ ہونے پائی

ہوا سکوں بھی میسر تو اضطراب رہا
دل خراب ہمیشہ دل خراب رہا

کہیں شفق کہیں یادوں کے بیکراں سائے
نہ دھوپ ہی رہی باقی نہ آفتاب رہا

خیال و خواب کا موسم بدل گیا چپ چاپ
نہ شاخ سبز نہ وہ نغمۂ گلاب رہا

تمام عمر کبھی جس سے کھل کے بات نہ کی
ہر اک سخن میں اسی سے مرا خطاب رہا

وہ اپنے گھر میں رہے خوش ہم اپنے گھر میں خوش
یہ تجربہ تھا محبت میں کامیاب رہا

شعبدے سب زبان کے دیکھے
زور سارے بیان کے دیکھے

گرمیاں سردیاں بہار خزاں
سب مزے اس جہان کے دیکھے

گیروا، سبز، چمپئی، دھانی
رنگ سب آسمان کے دیکھے

بھر گئی تھی زمین پھولوں سے
راستے درمیان کے دیکھے

برجیاں دور سے نظر آئیں
شہر نزدیک آن کے دیکھے

سونے دالان کھڑکیاں سنسان
خالی کمرے مکان کے دیکھے

غیر دلچسپ تھا یقین کا کھیل
سب کرشمے گمان کے دیکھے

rekhta

عشق میں کون بتا سکتا ہے
کس نے کس سے سچ بولا ہے

ہم تم ساتھ ہیں اس لمحے میں
دکھ سکھ تو اپنا اپنا ہے

مجھ کو تو سارے ناموں میں
تیرا نام اچھا لگتا ہے

بھول گئی وہ شکل بھی آخر
کب تک یاد کوئی رہتا ہے

rekhta

میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا
ایسا شخص بھی مر سکتا ہے

کبھی کبھی تو ہنسی آتی ہے
یہ دنیا کیسی دنیا ہے

اچھے دنوں کی آس نہ چھینو
یہی تو ایک دیا جلتا ہے

rekhta

بہت رک رک کے چلتی ہے ہوا خالی مکانوں میں
بجھے ٹکڑے پڑے ہیں سگرٹوں کے راکھ دانوں میں

دھوئیں سے آسماں کا رنگ میلا ہوتا جاتا ہے
ہرے جنگل بدلتے جا رہے ہیں کارخانوں میں

بھلی لگتی ہے آنکھوں کو نئے پھولوں کی رنگت بھی
پرانے زمزمے بھی گونجتے رہتے ہیں کانوں میں

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی پرواز تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

زبانوں پر الجھتے دوستوں کو کون سمجھائے
محبت کی زباں ممتاز ہے ساری زبانوں میں

rekhta

افسردگیِ شوق کی فرصت ہے ابھی تک
صد شکر مرا عشق سلامت ہے ابھی تک

پتھر ابھی پنہاں ہے خدو خال کے پیچھے
قائم ترے چہرے کی صباحت ہے ابھی تک

دل میں ابھی روشن ہے شفق تیرے لبوں کی
اس آتشِ خاموش میں حدت ہے ابھی تک

تبدیلیِ حالات کے چرچے تو بہت ہیں
لیکن وہی حالات کی صورت ہے ابھی تک

ہنستا ہوں کہ قدغن کوئی رونے پہ نہیں ہے
زندہ ہوں کہ مرنے کی اجازت ہے ابھی تک

تیری نظروں نے یہ بات اب مجھے سمجھائی ہے
کل محبت تھی ہوس آج کی سچا ئی ہے

جس سے گذرا ہوں مرے شعر ہیں اس آگ کی راکھ
جس میں لپٹا ہوں وہ چادر مری تنہائی ہے

جنگ اپنے سے لڑی ہو تو شکایت کیسی
مرا دشمن مرا بازو ہے مرا بھائی ہے

کچھ تو بولے مجھے ناکام تمنا تو کہا
یہ بھی یادوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہے

جمع تفریق سے تھا دشت تمنا خالی
حاصل شوق یہی ہے جو ہوا کھائی ہے

rekhta

دل کو یاد شام ہجر پھر اداس کر گئی
پھر چراغ وصل سے روشنی اتر گئی

دیکھ اے فسردگی زندگی عجیب ہے
خواہش بہار اگر مر گئی تو مر گئی

ساری رات ایک خواب دیکھتا رہا ہوں میں
ایک ہی خیال میں زندگی گذر گئی

شوق بے کنار سے چشم ناصبور تک
روشنی تھی دور تک دور تک نظر گئی

ہے بے توجہی میں نہاں اس کا دیکھنا
ہوتا نہیں ہے سب پہ عیاں اس کا دیکھنا

اہل نظر کو اس کا تغافل بہار ہے
اہل ہوس کے حق میں خزاں اس کا دیکھنا

ہاں اے شگفت غنچہ کہاں اس کی گفتگو
اے چشمک ستارہ کہاں اس کا دیکھنا

اب ایک شغل ہے ترے ایذا پسند کا
جو زخم بھر چکا ہے نشاں اس کا دیکھنا

مقصد ہے زندگی کا اگر کچھ تو بس یہی
سگرٹ کا کش لگا کے دھواں اس کا دیکھنا

rekhta

کیسے انھیں بھلاؤں محبت جنھوں نے کی
مجھ کو تو وہ بھی یاد ہیں نفرت جنھوں نے کی

دنیا میں احترام کے قابل وہ لوگ ہیں
اے ذلت وفا، تری عزت جنھوں نے کی

تزئین کائنات کا باعث وہی بنے
دنیا سے اختلاف کی جرأت جنھوں نے کی

آسودگانِ منزلِ لیلیٰ اداس ہیں
اچھے رہے، نہ طے یہ مسافت جنھوں نے کی

اہل ہوس تو خیر ہوس میں ہوئے ذلیل
وہ بھی ہوئے خراب محبت جنھوں نے کی

ترا وجود ہی سب سے بڑی حقیقت ہے
تجھے بھلا نہیں سکتا یہی محبت ہے

گلہ نہیں ہے تری بے تعلقی سے مجھے
میں جانتا ہوں تجھے بھولنے کی عادت ہے

دل حزیں کو بڑی دیر میں ہوا معلوم
یہی کہ تیری محبت میری ضرورت ہے

مری طلب میں ہے ٹھنڈک گئے زمانوں کی
ترے لہو میں نئے موسموں کی حدت ہے

خود اپنی ذات کا جب تجزیہ کیا تو کھلا
ترے بغیر بھی جینے کی ایک صورت ہے

rekhta

جانا ہے جب سے دل کو ہے دھڑکا لگا ہوا
میں چھوڑ جاؤں گا یہ تماشا لگا ہوا

محفوظ دستبرد زمانہ سے کچھ نہیں
ہر شے کی گھات میں ہے یہ چیتا لگا ہوا

افسردگی حسن سے اے دل نہ ہو ملول
ہر روشنی کے ساتھ ہے سایہ لگا ہوا

تنہائی تو کسی کو میسر نہیں یہاں
ہر راہرو کے ساتھ ہے رستہ لگا ہوا

rekhta

کیسے ہر آن بدل جاتا ہے منظر دیکھو
کس قدر تیز ہوا چلتی ہے باہر دیکھو

اک نظر حال دل زار بتا سکتی ہے
آنکھ رکھتے ہو تو قطرے میں سمندر دیکھو

اس قدر گونج ہے اس رات کے سناٹے میں
نہ یقیں آئے تو آواز لگا کر دیکھو

دل کو بے وجہ سکوں ملنے لگا ہے مشتاق
کوئی شے ٹوٹ رہی ہے مرے اندر دیکھو

rekhta

روشنی رہتی تھی دل میں، زخم جب تک تازہ تھا
اب جہاں دیوار ہے پہلے یہاں دروازہ تھا

درد کی اک موج ہر خواہش بہا کر لے گئی
کیا ٹھہرتیں بستیاں ، پانی ہی بے اندازہ تھا

رات ساری خواب کی گلیوں میں ہم چلتے رہے
کھڑکیاں روشن تھیں لیکن بند ہر دروازہ تھا

رخصت شب کا سماں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
اتنا روشن آسماں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

دور تک پھیلا ہوا صحرا نظر آیا مجھے
ایک ذرہ بھی جہاں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

دیدنی تھا موج دریا کا نشاط بے پناہ
جلوۂ آب رواں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

اہل دنیا تو ہمیشہ ہی سے ایسے تھے مگر
عشق اتنا ناتواں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

دل پریشاں ہوگیا رنگ زوال حسن سے
آگ دیکھی تھی، دھواں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

اس قدر حیراں نہ ہو آنکھوں میں آنسو دیکھ کر
تجھ کو اتنا مہرباں پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

کیا خبر راستے میں رہ جاؤں
سوچتا ہوں کسی سے کہہ جاؤں

اس لئے حال دل نہیں کہتا
کہیں جذبات میں نہ بہہ جاؤں

وہ مجھے بھول تو نہیں سکتے
ہاں اگر ان کو یاد رہ جاؤں

دل نے کچھ بستیاں بسائی ہیں
کاش انھی بستیوں میں رہ جاؤں

rekhta

وہ جس کی آرزو میرے دل تنہا میں رہتی ہے
انھی رستوں پہ چلتی ہے اسی دنیا میں رہتی ہے

محبت ہے جہاں میں منبع حسن و توانائی
اسی قوت کے بل پر زندگی اشیا میں رہتی ہے

محبت میں فراق و وصل کا جھگڑا نہیں ہوتا
ستارے عرش پر ہیں روشنی صحرا میں رہتی ہے

خوشی ہی اس سے واقف ہے نہ غم ہی کو خبر اس کی
وہ سرشاری جو اک رنج نشاط افزا میں رہتی ہے

اگر دیکھیں تو چپ لگ جائے ان ساحل نشینوں کو
جو طغیانی سکوت سینۂ دریا میں رہتی ہے

جس نے ایجاد کیا روح کی سرشاری کو
جسم کی جلوہ نمائی بھی ہنر اس کا ہے

راہ اس کی ہے تھکن اس کی ہے منزل اس کی
ہم کرائے کے مسافر ہیں سفر اس کا ہے

اپنا حصہ ہے فقط سایۂ اشجار میں سیر
باغ اس کا ہے گل اس کے ہیں ثمر اس کا ہے

اجنبی لوگ ہیں اور ایک سے گھر ہیں سارے
کس سے پوچھیں کہ یہاں کون سا گھر اس کا ہے

چاندنی رات تھی اک پھول تھا اک سایہ تھا
پھول سے پھول اگا سائے سے نکلا سایہ

میں تجھے بھول نہ جاتا تو خزاں ہی رہتی
شاخ پر پھول تری یاد دلانے آیا

کیسے لہراتے تھے پت جھڑ کی ہوا میں ترے بال
میں نے دیکھا ہی نہیں جی تو بہت للچایا

موسم درد بنا دیتا ہے شعلے کو گلاب
دکھ اٹھانے سے پلٹ جاتی ہے دکھ کی کایا

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

جس کی سانسوں سے مہکتے تھے در و بام ترے
اے مکاں بول! کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

ہمیں سب اہل ہوس ناپسند رکھتے ہیں
کہ ہم لوائے محبت بلند رکھتے ہیں

اسی لئے تو خفا ہیں ستم شعار کہ ہم
نگاہ نرم و دل درد مند رکھتے ہیں

اگر چہ دل وہی رجعت پسند ہے اپنا
مگر زبان ترقی پسند رکھتے ہیں

ہم ایسے عرش نشینوں سے وہ درخت اچھے
جو آندھیوں میں بھی سر کو بلند رکھتے ہیں

چلے ہو دیکھنے مشتاق جن کو پچھلی رات
وہ لوگ شام سے دروازہ بند رکھتے ہیں

کہیں امید سی ہے دل کے نہاں خانے میں
ابھی کچھ وقت لگے گا اسے سمجھانے میں

موسم گل ہو کہ پت جھڑ ہو بلا سے اپنی
ہم کہ شامل ہیں نہ کھلنے میں نہ مرجھانے میں

ہم سے مخفی نہیں کچھ رہگذر شوق کا حال
ہم نے اک عمر گذاری ہے ہوا کھانے میں

ہے یوں ہی گھومتے رہنے کا مزا ہی کچھ اور
ایسی لذت نہ پہنچنے میں نہ رہ جانے میں

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

موسموں کا کوئی محرم ہو تو اس سے پوچھوں
کتنے پت جھڑ ابھی باقی ہیں بہار آنے میں

یہ کہنا تو نہیں کافی کہ بس پیارے لگے ہم کو
انھیں کیسے بتائیں ہم کہ وہ کیسے لگے ہم کو

مکیں تھے یا کسی کھوئی ہوئی جنت کی تصویریں
مکاں اس شہر کے بھولے ہوئے سپنے لگے ہم کو

ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو

بہت شفاف تھے جب تک کہ مصروف تمنا تھے
مگر اس کار دنیا میں بڑے دھبے لگے ہم کو

جہاں تنہا ہوئے دل میں بھنور سے پڑنے لگتے ہیں
اگرچہ مدتیں گذریں کنارے سے لگے ہم کو

چپکے چپکے گھر میں بیٹھے عاشقی کرتے رہے
چھاؤں میں رہ کر عبادت دھوپ کی کرتے رہے

اس لئے گھر سے نہ نکلے تم نہ آجاؤ کہیں
تم نہ آئے عمر بھر ہم یاد ہی کرتے رہے

یوں تو پندار خدائی تھا پر اس کے باوجود
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی بندگی کرتے رہے

کاش ہم نے بھی سنی ہوتی کبھی دل کی پکار
چاہتی تھی ہم سے جو دنیا وہی کرتے رہے

اب بتائیں بھی تو کیسے دل کے بجھنے کا سبب
ہم کہ اپنے آپ سے پہلو تہی کرتے رہے

مطمئن تو خیر کیا ہوں گے مگر نادم نہیں
دل میں جب تک آگ تھی ہم روشنی کرتے رہے

rekhta

لبھاتا ہے اگرچہ حسن دریا ڈر رہا ہوں میں
سبب یہ ہے کہ اک مدت کنارے پر رہا ہوں میں

یہ جھونکے جن سے دل میں تازگی آنکھوں میں ٹھنڈک ہے
انھی جھونکوں سے مرجھایا ہوا شب بھر رہا ہوں میں

ترے آنے کا دن ہے تیرے رستے میں بچھانے کو
چمکتی دھوپ میں سائے اکٹھے کر رہا ہوں میں

کوئی کمرہ ہے جس کے طاق میں اک شمع جلتی ہے
اندھیری رات ہے اور سانس لیتے ڈر رہا ہوں میں

مجھے معلوم ہے اہل وفا پر کیا گزرتی ہے
سمجھ کر سوچ کر تجھ سے محبت کر رہا ہوں میں

❂

پرزے بن کر اڑ گئیں پریاں گہری نیند کی
تند ہوائیں لے گئیں ٹکڑے اجلے خواب کے

صحرا بن کر رہ گیا دریا ٹھاٹھیں مارتا
موجیں بن کر چل پڑے ذرے ریت سراب کے

کتنی فصلیں کاٹتی کند درانتی درد کی
لہریں ماریں چار سو پھیلے کھیت عذاب کے

لیٹی تھیں دو مورتیں سبز سنہری گھاس پر
ان کے چاروں اور تھے بوٹے لال گلاب کے

سدا سہاگ ہو گودی رہے بھری تیری
مسرتوں سے لبالب ہو زندگی تیری

سدا رہیں تری جلوہ گری کے ہنگامے
سدا رہے یہ منور فسردگی تیری

رہِ وفا میں خوشی کم ہے اور ملال بہت
خدا کرے کہ سلامت رہے ہنسی تیری

rekhta

تیری تلاش میں چل تو پڑا ہوں جانے تجھے پاؤں کہ نہ پاؤں
شاید اس گنجان سفر میں آپ ہی اپنے ہاتھ آجاؤں

گھر کی باس اور جسم کی خوشبو بڑے بڑوں کو بھلا دیتی ہے
مجھ میں کیا سرخاب کا پر ہے آخر کیوں تجھ کو یاد آؤں

آگ تو چاروں اور لگی ہے پتی پتی بھڑک رہی ہے
دھڑ دھڑ جلتی ہیں شاخیں دیکھوں اور گذرتا جاؤں

ایک سے بڑھ کر ایک نظارہ دمک رہا ہے عالم سارا
آنکھیں دو اور حسن بہت ہے کہاں کہاں دامن پھیلاؤں

چھوٹے ہیں خوابوں کے ٹکڑے درد کے رقبے بڑے بڑے ہیں
جس میں سما جائیں دکھ سارے ایسا خواب کہاں سے لاؤں

خبر کیا تجھ کو پیارے دردِ ہستی کے شکنجے کی
ابھی شاید شکن بھی تیرے بستر میں نہیں ہوگی

جو اک خاموش سے کمرے میں رونق میں نے دیکھی ہے
وہ رونق شہر کے شاید کسی گھر میں نہیں ہوگی

کلی ایسی ہے وہ پورا گلستاں جس سے خالی ہے
وہ موج ایسی ہے جو سارے سمندر میں نہیں ہوگی

شفق پھولی ہے آؤ بادلوں کے رنگ ہی دیکھیں
جو صورت اب ہے یہ صورت گھڑی بھر میں نہیں ہوگی

وہی نظر کہ جو اٹھتی رہی مری جانب
اسی نظر میں کسی اور کا خیال بھی تھا

مجھے ہی بات بڑھانے کی آرزو نہ ہوئی
یہ اور بات کہ ملنا ترا محال بھی تھا

میں تیرا کون تھا لیکن سلوک میں تیرے
خلوص بھی تھا محبت کا احتمال بھی تھا

کھڑی ہے دل میں تری رخصتی کی شام اب تک
عجب طرح کی مسرت بھی تھی ملال بھی تھا

تمام رات پھڑکتے رہے گلاب کے پھول
ہوا بھی تیز تھی اور ٹہنیوں کا جال بھی تھا

زندگی سے ایک دن موسم خفا ہو جائیں گے
رنگ گل اور بوئے گل دونوں ہوا ہو جائیں گے

آنکھ سے آنسو نکل جائیں گے اور ٹہنی سے پھول
وقت بدلے گا تو سب قیدی رہا ہو جائیں گے

پھول سے خوشبو بچھڑ جائے گی سورج سے کرن
سال سے دن وقت سے لمحے جدا ہو جائیں گے

کتنے پر امید کتنے خوبصورت ہیں یہ لوگ
کیا یہ سب بازو یہ سب چہرے فنا ہو جائیں گے

چھن گئی تیری تمنا بھی تمنائی سے
دل بہلتے ہیں کہیں حوصلہ افزائی سے

کیسا روشن تھا ترا نیند میں ڈوبا چہرہ
جیسے ابھرا ہو کسی خواب کی گہرائی سے

وہی آشفتہ مزاجی وہی خوشیاں وہی غم
عشق کا کام لیا ہم نے شناسائی سے

نہ کبھی آنکھ بھر آئی نہ ترا نام لیا
بچ کے چلتے رہے ہر کوچۂ رسوائی سے

ہجر کے دم سے سلامت ہے ترے وصل کی آس
ترو تازہ ہے خوشی غم کی توانائی سے

کھل کے مرجھا بھی گئے فصل ملاقات کے پھول
ہم ہی فارغ نہ ہوئے موسم تنہائی سے

rekhta

رات پچھلے پہر وہ ہوائیں چلیں پھول رونے لگے زخم گانے لگے
تیرے جانے کے دن تیرے آنے کے دن یاد کی شاخ پر چہچہانے لگے

کون آیا مرے گھر کی دہلیز پر کچی مٹی کا فانوس تھامے ہوئے
بام پر جل اٹھیں گھاس کی پتیاں آنگنوں میں دیے سرسرانے لگے

آنکھ میں ان کہے ان سنے واہمے کان میں گرم آغوش کے زمزمے
تھک کے سونے لگیں سیج پر دلہنیں خواب ٹھنڈے دنوں کے ستانے لگے

خشک تالاب ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں ادھ کھلے پھول پر سوختہ کھڑکیاں
پھر کوئی شہر آنکھوں میں پھرنے لگا پھر مجھے راستے یاد آنے لگے

رفتہ رفتہ سبھی خواہشیں بجھ گئیں آج پھر تیز بارش کا امکان ہے
دل سے وہ حرف بھی مٹ نہ جائیں کہیں جس کی شکلیں بناتے زمانے لگے

کس شے پہ یہاں وقت کا سایہ نہیں ہوتا
اک خواب محبت ہے کہ بوڑھا نہیں ہوتا

وہ وقت بھی آتا ہے جب آنکھوں میں ہماری
پھرتی ہیں وہ شکلیں جنھیں دیکھا نہیں ہوتا

بارش وہ برستی ہی کہ بھر جاتے ہیں جل تھل
دیکھو تو کہیں ابر کا ٹکڑا نہیں ہوتا

گھر جاتا ہے دل درد کی ہر بند گلی میں
چاہو کہ نکل جائیں تو رستہ نہیں ہوتا

یادوں پہ بھی جم جاتی ہے جب گردِ زمانہ
ملتا ہے وہ پیغام کہ پہنچا نہیں ہوتا

تنہائی میں کرنی تو ہے اک بات کسی سے
لیکن وہ کسی وقت اکیلا نہیں ہوتا

کیا اس سے گلہ کیجئے بربادیِ دل کا
ہم سے بھی تو اظہارِ تمنا نہیں ہوتا

rekhta

وہ جو ایک وقفۂ عمر تھا تری آرزو میں بسر کیا
کبھی منتظر رہے شام کے کبھی انتظار سحر کیا

کبھی سال سال نہ طے ہوئیں کسی نقش پا کی مسافتیں
کبھی ایک لمحۂ شوق میں کئی منزلوں کا سفر کیا

یہ خرد نہ روک سکی کبھی مرے خیر و شر کے فساد کو
مری خواہشوں کے تضاد کو ترے غم نے شیر و شکر کیا

میں کبھی یہ حرف نہ بولتا میں کبھی یہ راز نہ کھولتا
تری آنکھ نے دیا حوصلہ تو یہ بوجھ ادھر سے ادھر کیا

وہ جو ایک وقفۂ عمر تھا تری آرزو میں بسر کیا
کبھی منتظر رہے شام کے کبھی انتظار سحر کیا

کبھی سال سال نہ طے ہوئیں کسی نقش پا کی مسافتیں
کبھی ایک لمحۂ شوق میں کئی منزلوں کا سفر کیا

یہ خرد نہ روک سکی کبھی مرے خیر و شر کے فساد کو
مری خواہشوں کے تضاد کو ترے غم نے شیر و شکر کیا

میں کبھی یہ حرف نہ بولتا میں کبھی یہ راز نہ کھولتا
تری آنکھ نے دیا حوصلہ تو یہ بوجھ ادھر سے ادھر کیا

گو اس طرف سے بات کا امکاں نہ تھا کوئی
لیکن مرے سوال پہ حیراں نہ تھا کوئی

چھوٹا سا ایک گھر تھا درختوں کی اوٹ میں
بام بلند و زینۂ پیچاں نہ تھا کوئی

یوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہم رہے
جیسے دلوں میں دید کا ارماں نہ تھا کوئی

آنکھوں میں عمر بھر وہی صورت بسی رہی
جس سے دل و نگاہ کا پیماں نہ تھا کوئی

گذرے نظر سے یوں تو کئی ارمغاں مگر
دیکھا تو اس کی شان کے شایاں نہ تھا کوئی

حسن و جمال عشق و ہوس وصل و انتظار
سب درد ہی کے روپ تھے درماں نہ تھا کوئی

rekhta

نین کھلتے نہ تھے نیند آتی نہ تھی رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی
سارے اوراقِ غم منتشر ہو گئے دیر تک دل میں آندھی سی چلتی رہی

گھاس تھی جگنوؤں کو چھپائے ہوئے پیڑ تھے تیرگی میں نہائے ہوئے
ایک کونے میں سر کو جھکائے ہوئے درد کی شمع افسردہ جلتی رہی

پہلا دن تھا محبت کی برسات کا وقت ٹھہرا تھا تجھ سے ملاقات کا
قطرہ قطرہ گذرتی رہیں ساعتیں سائے لپٹے رہے دھوپ چلتی رہی

رنج پچھلی مسرت کے سہتے تھے ہم ایک ہی قریۂ جاں میں رہتے تھے ہم
دن ڈھلے یا کسی صبح کے موڑ پر اپنے ملنے کی صورت نکلتی رہی

ایک راتوں سے بچھڑی ہوئی رات میں ہم اکیلے تھے خواب ملاقات میں
دونوں اک دوسرے کی طرف چل پڑے خواب گھٹتا رہا رات ڈھلتی رہی

چہروں سے پھوٹتی ہے مسرت کبھی کبھی
روحوں میں بولتی ہے یہ دولت کبھی کبھی

ہر بوسے کو نصیب نہیں لمحۂ نشاط
جسموں میں جاگتی ہے یہ لذت کبھی کبھی

اٹھا ہے کس سے بارِ غمِ عشق عمر بھر
آتی ہے جسم و جاں میں یہ طاقت کبھی کبھی

کچھ اپنے رنج اپنی مسرت بچا کے رکھ
پڑتی ہے آدمی کو ضرورت کبھی کبھی

وہ سو رہا ہو اور اسے دیکھتا رہوں
مشتاق چاہتی ہے طبیعت کبھی کبھی

عجب نہیں کبھی نغمہ بنے فغاں میری
مری بہار میں شامل ہے اب خزاں میری

میں اپنے آپ کو اوروں میں رکھ کے دیکھتا ہوں
کہیں فریب نہ ہوں دردمندیاں میری

میں اپنی قوت اظہار کی تلاش میں ہوں
وہ شوق ہے کہ سنبھلتی نہیں زباں میری

یہی سبب ہے کہ احوال دل نہیں کہتا
کہوں تو اور الجھتی ہیں گتھیاں میری

میں اپنے عجز پہ نادم نہیں ہوں ہم سخنو
ہزار شکر طبیعت نہیں رواں میری

کھلی فضا میں بھی چاروں طرف سلاخیں تھیں
میں وہ اسیر جو خوابوں میں بھی رہا نہ ہوا

فسانۂ غم دل اعتراف جرم نہ تھا
یہ کیا ہوا کہ سنانے کا حوصلہ نہ ہوا

rekhta

کیوں میرے حالِ دل پر اس کی نظر نہیں ہے
شاید اسے خبر ہو مجھ کو خبر نہیں ہے

سب کی نظر بچا کر میں دیکھتا ہوں اس کو
کیوں دیکھتا ہوں اس کو وہ بے خبر نہیں ہے

rekhta

وہ جن کے ساتھ چلتا تھا زمانہ
ابھی اس راہ سے تنہا گئے ہیں

جدائی عشق میں ہے کیوں ضروری
وہ سب باتیں مجھے سمجھا گئے ہیں

اندھیرا دیکھ کر کمرہ کسی کا
ستارے روز نوں تک آ گئے ہیں

rekhta

وقت نے رنگ اڑا دیئے سارے
کل جو تصویر تھی کہاں ہے آج

کارِ دنیا میں کھو نہ جاؤں کہیں
تو مجھے یاد کر جہاں ہے آج

بجھا ہو دل تو کسی کی ادا نہیں چلتی
کوئی گزارش آب و ہوا نہیں چلتی

کسی طرح نہیں جاتی فسردگی دل کی
کوئی دعا کوئی حمد و ثنا نہیں چلتی

rekhta

اشعار

وہ شخص ہمیشہ سکھی رہے جس کے اس شہر میں ہونے سے
شاداب رہے مہ و سال مرے سرسبز مرے اوقات رہے

کیا بتائیں تجھے کیا ہجر میں دل پر گذری
آنکھیں سبزے کو ترس جائیں تو کیا ہوتا ہے

وقت ہر چیز کی تقدیر بدل دیتا ہے
میں نے دیکھا ہے محبت کا فنا ہو جانا

دو پہر کے وقت ٹھنڈی گھاس پر لیٹا ہوا
صاف نیلے آسماں کو دیکھتا رہتا ہوں میں

ہم اپنے دکھ بھرے دل کی کہانی کہتے رہتے ہیں
ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں دریا بہتے رہتے ہیں

کلیات، طباعت اول

اجلا ترا برتن ہے اور صاف ترا پانی
اک عمر کا پیاسا ہوں مجھ کو بھی پلا پانی

ہے اک خط نادیدہ دریائے محبت میں
ہوتا ہے جہاں آکر پانی سے جدا پانی

دونوں ہی تو سچے تھے الزام کسے دیتے
کانوں نے کہا صحرا آنکھوں نے سنا پانی

کیا کیا نہ ملی مٹی کیا کیا نہ دھواں پھیلا
کالا نہ ہوا سبزہ میلا نہ ہوا پانی

جب شام اترتی ہے کیا دل پہ گزرتی ہے
ساحل نے بہت پوچھا خاموش رہا پانی

پھر دیکھ کہ یہ دنیا کیسی نظر آتی ہے
مشتاق مئے غم میں تھوڑا سا ملا پانی

rekhta

فضائے دل پہ کہیں چھا نہ جائے یاس کا رنگ
کہاں ہو تم کہ بدلنے لگا ہے گھاس کا رنگ

تمھارے بعد بہت آندھیاں چلیں پھر بھی
بجھا نہیں مری آنکھوں کے آس پاس کا رنگ

ملی ہیں اور بھی خوش وضع صورتیں لیکن
نہ وہ بدن کی مہک تھی نہ وہ لباس کا رنگ

جدا ہوئے تو کئی رنگ تھے خیالوں میں
ملے تو ایک تھا پانی کا رنگ پیاس کا رنگ

تو چھپاتے ہوئے لفظ کیا کریں مشتاق
جھلک اٹھے جو غزل میں دل اداس کا رنگ

اشک دامن میں بھرے خواب کمر پر رکھا
پھر قدم ہم نے تری راہگذر پر رکھا

ہم نے ایک ہاتھ سے تھاما شب غم کا آنچل
اور اک ہاتھ کو دامان سحر پر رکھا

چلتے چلتے جو تھکے پاؤں تو ہم بیٹھ گئے
نیند گٹھری پہ دھری خواب شجر پر رکھا

جانے کس دم نکل آئے ترے رخسار کی دھوپ
مدتوں دھیان ترے سایۂ در پر رکھا

جاتے موسم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا مشتاق
رہ گیا ساغر گل سبزۂ تر پر رکھا

یہ کس ترنگ میں ہم نے مکان بیچ دیا
درخت کاٹ لئے سائبان بیچ دیا

دری لپیٹ کے رکھ دی بساط الٹ ڈالی
چراغ توڑ دیئے شمع دان بیچ دیا

خزاں کے ہاتھ خزاں کے نیازمندوں نے
نوائے موسم گل کا نشان بیچ دیا

اٹھا جو شور تو اہل ہوس نے گھبرا کر
زمین لیز پہ دے دی کسان بیچ دیا

یہی ہے بھوک کا عالم تو دیکھنا اک دن
کہ ہم نے دھوپ بھرا آسمان بیچ دیا

کوئی نہیں جو کہے داستان موسم گل
ملیں گے یوں تو بہت محرمان موسم گل

کھلی جو آنکھ تو پتوں کا مینھ برسنے لگا
تنا ہوا تھا ابھی سائبان موسم گل

وہ جن کے ہاتھ ہیں خون گلاب سے رنگیں
بنے ہوئے ہیں وہی عاشقان موسم گل

دلوں میں خواب ہیں اور جھولیوں میں پت جھڑ ہے
عجیب حال میں ہیں بیکسان موسم گل

ہم ایسے خاک نشینوں کا آسرا ہے یہی
یہ سرزمین خزاں آسمان موسم گل

برس کر کھل گیا ابر خزاں آہستہ آہستہ
ہوا میں سانس لیتے ہیں مکاں آہستہ آہستہ

بہت عرصہ لگا رنگ شفق معدوم ہونے میں
ہوا تاریک نیلا آسماں آہستہ آہستہ

کہیں پتوں کے اندر دھیمی دھیمی سرسراہٹ ہے
ابھی ہلنے لگیں گی ڈالیاں آہستہ آہستہ

جہاں ڈالے تھے اس نے دھوپ میں کپڑے سکھانے کو
ٹپکتی ہیں ابھی تک رسیاں آہستہ آہستہ

سماعت میں ابھی تک آہٹوں کے پھول کھلتے ہیں
کوئی چلتا ہے دل کے درمیاں آہستہ آہستہ

بدل جائے گا موسم، درد کی شاخ برہنہ میں
نکلتی آ رہی ہیں پتیاں آہستہ آہستہ

مل ہی آتے ہیں اسے ایسا بھی کیا ہو جائے گا
بس یہی نا، درد کچھ دل کا سوا ہو جائے گا

وہ مرے دل کی پریشانی سے افسردہ ہو کیوں
دل کا کیا ہے کل کو پھر اچھا بھلا ہو جائے گا

گھر سے، کچھ خوابوں سے ملنے کے لئے نکلے تھے ہم
کیا خبر تھی زندگی سے سامنا ہو جائے گا

رونے لگتا ہوں محبت میں تو کہتا ہے کوئی
کیا ترے اشکوں سے یہ جنگل ہرا ہو جائے گا

کیسے آسکتی ہے ایسی دل نشیں دنیا کو موت
کون کہتا ہے کہ یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا

وہ جو بے کلی مرے دل کو تھی وہ جو اضطراب تھا اب کہاں
جو بہت ہوا تو چمک گئیں کبھی درد ہجر کی بجلیاں

میرے جسم و جاں کے نواح سے وہ ہوا وہ دھوپ گذر گئی
نہ وہ دل گداز مسرتیں نہ وہ دل نواز اداسیاں

سر شاخ درد نہ گھاس پر، نہ کسی کے زرد لباس پر
وہ گلاب جانے کدھر گئے جو ابھی کھلے تھے یہاں وہاں

میرے راستے میں اگے ہوئے کسی اور راہ کے پیڑ ہیں
میرے شہر پر ہے جھکا ہوا کسی اور شہر کا آسماں

ہوئی فصل گل تو کھلیں گے ہم رہی زندگی تو ملیں گے ہم
کسی اور دھیان کے روبرو کسی اور خواب کے درمیاں

نیا کلام

صورتیں بدلیں محبت نے جوانی میں بہت
موڑ آئے دردِ ہستی کی کہانی میں بہت

ہر نئے چہرے کے ساتھ اک آرزو جاتی رہی
گم ہوئیں چیزیں مری نقل مکانی میں بہت

کچھ تو میں بھی تنگیِ دل سے تھا گھبرایا ہوا
کچھ کشش بھی تھی فضا کی بیکرانی میں بہت

ہاں ترے ملنے سے پہلے اس قدر دوری نہ تھی
فاصلہ کم تھا ملال و شادمانی میں بہت

اب ہوا معلوم دل میں دائرے کیسے بنے
میں جو کنکر پھینکتا رہتا تھا پانی میں بہت

rekhta

ہو گیا شہر پرندوں کی صدا سے خالی
پیٹ بھرتے ہیں کہیں آب و ہوا سے خالی

چھن گئی چھاؤں درختوں سے ہوا سے ٹھنڈک
دجلۂ عشق ہوا آب صفا سے خالی

آستاں منقبت درد کے محرم نہ رہے
ساز سرمست ہوا سوز و صدا سے خالی

میں بظاہر تو ہوں درویش مگر دل میرا
حرص دنیا سے ہے پر خوف خدا سے خالی

ایسا کچھ کر کہ یہ دل لذت غم سے بھر جائے
جی بہلتا نہیں انداز و ادا سے خالی

تھا مجھ سے ہم کلام مگر دیکھنے میں تھا
جانے وہ کس خیال میں تھا کس سے میں تھا

کیسے مکاں اجاڑ ہوا کس سے پوچھتے
چولھے میں روشنی تھی نہ پانی گھڑے میں تھا

تا صبح برگ و شاخ و شجر جھومتے رہے
کل شب بلا کا سوز ہوا کے گلے میں تھا

نیندوں میں پھر رہا ہوں اسے ڈھونڈھتا ہوا
شامل جو ایک خواب مرے رتجگے میں تھا

rekhta

ہوئے شاخ شاخ دھواں گئے موسموں کے ملال میں
وہ جو بجلیوں کے درخت تھے مرے آشیان خیال میں

وہ خمار دیدۂ سرگیں وہ تراش لب وہ خط جبیں
وہ نشاط ساعت اولیں نہ فراق میں نہ وصال میں

یہ ہوائے قریۂ رفتگاں لئے پھر رہی ہے کہاں کہاں
کبھی جگنوؤں کے جنوب میں کبھی تتلیوں کے شمال میں

نہ دلوں میں خوف خدنگ لا نہ غم خروش نہنگ لا
وہی بے کلی سر شاخ ہے وہی اضطراب ہے جال میں

میں پھروں ہزار ادھر ادھر نہیں گرد و پیش سے بے خبر
مری آنکھ عہد قدیم پر مرا دل زمانۂ حال میں

دریچے کھل رہے ہیں شور برپا ہے مکانوں میں
سپاہی چوریاں کروا کے لوٹ آئے ہیں تھانوں میں

خیالوں میں کوئی کھڑکی کھلی چہرہ نظر آیا
شجر جاگے پرندے چہچہائے آشیانوں میں

ہوئیں بیدار ساز آرزو سے لرزشیں دل میں
صدا دینے لگے بھولے ہوئے نغمات کانوں میں

اب ان کے بے نوا اوراق فٹ پاتھوں پہ بکھرے ہیں
مقید تھیں کبھی شہزادیاں جن داستانوں میں

چراغ درد ہی بجھنے کو ہے جلنے سے کیا حاصل
زیادہ رتجگے اچھے نہیں ایسے زمانوں میں

کلی کھلی کسی بھولی ہوئی ادا کی طرح
بہار آئی محبت کی ابتدا کی طرح

تمام رات کسی اور آسمان کی دھوپ
نواحِ دل پہ برستی رہی گھٹا کی طرح

حصارِ غم کی شکستہ فصیل سے کوئی یاد
ٹھہر ٹھہر کے گذرتی رہی ہوا کی طرح

گذرنے والے تو کب کے گذر چکے دل سے
یہ کون چیز چمکتی ہے نقشِ پا کی طرح

آنسوؤں سے نہ ڈرو آہ و بکا ہونے دو
جشن رامش گری آب و ہوا ہونے دو

دیکھنا پھر اسی اجڑے ہوئے گلشن کی بہار
مینھ برسنے دو درختوں کو ہرا ہونے دو

مستی عشق ہو یا خواب فراموشی ہو
جس کا جو قرض بھی سر پر ہے ادا ہونے دو

میں نے دل سے کہا ہم جھیل گئے ہجر کا دن
دل نے چپکے سے کہا شام ذرا ہونے دو

rekhta

اس کی کنج گلی سے آگے گلیاں کوچے اور بھی ہیں
اور بھی ہیں کچھ پریم کے بندھن درد کے رشتے اور بھی ہیں

ادھر ادھر لوگوں سے مل کر اتنا تو معلوم ہوا
میں ہی نہیں دنیا میں تنہا میرے جیسے اور بھی ہیں

عشق و وفا کے کھیل کو اتنا سیدھا سادہ مت جانو
وصل کے اور فرقت کے علاوہ اس میں جھگڑے اور بھی ہیں

ایک انوکھا کنج ہے اس میں یادوں کے گل بوٹوں کا
یوں تو دل میں باغ بغیچے جنگل بیلے اور بھی ہیں

✪

یہ سلگتے درودیوار یہ جلتا موسم
گردش شام و سحر لا کوئی ٹھنڈا موسم

وہ مرے دھوپ سے دن چاندنی جیسی راتیں
کیسا اجلا تھا تری دید کا پہلا موسم

لے اڑے رونق گل خوف خزاں کے جھونکے
کر دیا ہجر کی برسات نے میلا موسم

دل نہ اچھا ہو تو کچھ بھی نہیں اچھا لگتا
سایۂ گیسوے دلدار نہ اچھا موسم

گردش عشق جدا گردش ایام جدا
رت بدلنے سے بدلتا نہیں دل کا موسم

موسم گل جسے کہتے ہیں یقیناً ہوگا
آج تک ہم نے تو دیکھا نہیں ایسا موسم

rekhta

سب اگلے پچھلے سے لوٹ آئے پانی میں
ترے خیال نے جادو جگائے پانی میں

کنار آب رواں جگنوؤں کا میلہ تھا
ستارے صبح تلک جھلملائے پانی میں

جنھیں قریب سے دیکھا تھا خشکیوں پہ کبھی
وہ لوگ ہم کو بہت یاد آئے پانی میں

اندھیری رات ہے اب اور کوئی نہیں اتنا
جو جا کے موج سحر کھینچ لائے پانی میں

گذر رہی ہے تمنا کے ساحلوں سے ہوا
لرز رہے ہیں درختوں کے سائے پانی میں

(محمد سلیم الرحمٰن کے لئے)

شبنم کو ریت پھول کو کانٹا بنا دیا
ہم نے تو اپنے باغ کو صحرا بنا دیا

اس اونچ نیچ پر تو ٹھہرتے نہیں تھے پاؤں
کس دست شوق نے اسے دنیا بنا دیا

کن مٹھیوں نے بیج بکھیرے زمین پر
کن بارشوں نے اس کو تماشا بنا دیا

سیراب کردیا تری موج خرام نے
رکھا جہاں قدم وہاں دریا بنا دیا

اک رات چاندنی مرے بستر پہ آئی تھی
میں نے تراش کر ترا چہرہ بنا دیا

پوچھے اگر کوئی تو اسے کیا بتاؤں میں
دل کیا تھا تیرے غم نے اسے کیا بنا دیا

rekhta

(شاہد حمید کے لئے)

دل میں وہ شور نہ آنکھوں میں وہ نم رہتا ہے
اب تپ ہجر توقع سے بھی کم رہتا ہے

کبھی شعلے سے لپکتے تھے مرے سینے میں
اب کسی وقت دھواں سا کوئی دم رہتا ہے

کیا خدا جانے مرے دل کو ہوا تیرے بعد
نہ خوشی اس میں ٹھہرتی ہے نہ غم رہتا ہے

رشتۂ تار تمنا نہیں ٹوٹا اب تک
اب بھی آنکھوں میں تری زلف کا خم رہتا ہے

چھوڑ جاتی ہے ہر اک رت کوئی خوشبو کوئی رنگ
نہ ستم رہتا ہے باقی نہ کرم رہتا ہے

rekhta

کہاں کی گونج دل ناتواں میں رہتی ہے
کہ تھرتھری سی عجب جسم و جاں میں رہتی ہے

قدم قدم پہ وہی چشم و لب وہی گیسو
تمام عمر نظر امتحاں میں رہتی ہے

مزہ تو یہ ہے کہ وہ خود تو ہے نئے گھر میں
اور اس کی یاد پرانے مکاں میں رہتی ہے

پتہ تو فصل گل و لالہ کا نہیں معلوم
سنا ہے قرب و جوارِ خزاں میں رہتی ہے

میں کتنا وہم کروں لیکن اک شعاعِ یقیں
کہیں نواحِ دل بدگماں میں رہتی ہے

ہزار جان کھپاتا رہوں مگر پھر بھی
کمی سی کچھ مرے طرزِ بیاں میں رہتی ہے

وہ لڑکپن کے دن وہ پیار کی دھوپ
چھاؤں لگتی تھی رہگذار کی دھوپ

وہ کھلی کھڑکیاں مکانوں کی
وہ دوپہریں وہ کوئے یار کی دھوپ

کنج سورج مکھی کے پھولوں کے
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ سبزہ زار کی دھوپ

یہ بھی اک منظر زمینی ہے
خوف کے سائے گیرودار کی دھوپ

برف چاروں طرف ہے اور دل میں
گل آئندہ اور بہار کی دھوپ

rekhta

کس جھٹپٹے کے رنگ اجالوں میں آگئے
ٹکڑے شفق کے دھوپ سے گالوں میں آگئے

افسردگی کی لے بھی ترے قہقہوں میں تھی
پت جھڑ کے سر بہار کے جھالوں میں آگئے

اڑ کر کہاں کہاں سے پرندوں کے قافلے
نادیدہ پانیوں کے خیالوں میں آگئے

حسن تمام تھے تو کوئی دیکھتا نہ تھا
تم درد بن کے دیکھنے والوں میں آگئے

کانٹے سمجھ کے گھاس پہ چلتا رہا ہوں میں
قطرے تمام اوس کے چھالوں میں آگئے

کچھ رتجگے تھے جن کی ضرورت نہیں رہی
کچھ خواب تھے جو میرے خیالوں میں آگئے

rekhta

(ایک غزل شمس الرحمٰن فاروقی کے لئے)

دھڑکتی رہتی ہے دل میں طلب کوئی نہ کوئی
پکارتا ہے مجھے روز و شب کوئی نہ کوئی

شب الم ترے سادہ دلوں پہ کیا گذری
سحر ہوئی تو سنائے گا سب کوئی نہ کوئی

زبان بند ہے آنکھوں کے بند رہنے تک
کھلے گی آنکھ تو کھولے گا لب کوئی نہ کوئی

ہوائے ساز الم لاکھ احتیاط کرے
لرز ہی اٹھتا ہے تار طرب کوئی نہ کوئی

گھنے بنوں میں بھی رستہ نکل ہی آتا ہے
بنا ہی دیتی ہے قدرت سبب کوئی نہ کوئی

rekhta

(انتظار حسین کے لئے)

شام غم یاد ہے کب شمع جلی یاد نہیں
کب وہ رخصت ہوئے کب رات ڈھلی یاد نہیں

دل سے بہتے ہوئے پانی کی صدا گذری تھی
کب دھندلکا ہوا کب ناؤ چلی یاد نہیں

ٹھنڈے موسم میں پکارا کوئی ہم آتے ہیں
جس میں ہم کھیل رہے تھے وہ گلی یاد نہیں

ان مضافات میں چھپ چھپ کے ہوا چلتی تھی
کیسے کھلتی تھی محبت کی کلی یاد نہیں

جسم و جاں ڈوب گئے خواب فراموشی میں
اب کوئی بات بری ہو کہ بھلی یاد نہیں

rekhta

وہ ابھی محو ناز تھے اپنے لب و عذار میں
عکس خزاں گذر گیا آئینۂ بہار میں

یہ نہ سمجھ کہ حسن کو عشق سے واسطہ نہیں
موج غبار دل بھی ہے موج خرام یار میں

ایک لہولہان خواب چھوڑ گئی ہیں آندھیاں
اور تو کچھ نہیں بچا جان امیدوار میں

دامن صبر سے جدا ہونے لگی ہیں انگلیاں
کچھ نہیں جبر کے سوا اب ترے اختیار میں

شمعیں خموش ہوگئیں پروانے سو گئے
شہر خیال تیرے صنم خانے سو گئے

بوسے ہوئے نڈھال لبوں کی تلاش میں
ہاتھوں کے انتظار میں دستانے سو گئے

دیوانے اگلے رقص کی تیاریوں میں ہیں
سمجھو نہ درد تھم گیا ویرانے سو گئے

پھر دل کو نئی خوشی سے بھر جا
آ اور مجھے اداس کر جا

پھرتا رہوں دور دور کب تک
اک روز قریب سے گذر جا

سب لوگ اتر رہے ہیں اے دل
تو بھی کسی گھاٹ پر اتر جا

گلشن کو بہار کو خزاں کو
ٹک پیار سے دیکھ اور گذر جا

گل بھی تہ خاک گل بدن بھی
تو بھی اسی خاک میں بکھر جا

rekhta

اک پھول کہیں مہک رہا ہے
موسم پلکیں جھپک رہا ہے

کل رات کی برف کو بھرا پیڑ
ہولے ہولے جھٹک رہا ہے

اب دھوپ ہے اور ایک رخسار
کندن کی طرح دمک رہا ہے

اب شہر میں شام ہو رہی ہے
پیمانۂ جاں چھلک رہا ہے

ہنستی ہوئی رات میں کوئی ساز
بچوں کی طرح بلک رہا ہے

rekhta

پتہ اب تک نہیں بدلا ہمارا
وہی گھر ہے وہی قصبہ ہمارا

وہی ٹوٹی ہوئی کشتی ہے اپنی
وہی ٹھہرا ہوا دریا ہمارا

یہ مقتل بھی ہے اور کنجِ اماں بھی
یہ دل یہ بے نشاں کمرہ ہمارا

کسی جانب نہیں کھلتے دریچے
کہیں جاتا نہیں رستہ ہمارا

ہم اپنی دھوپ میں بیٹھے ہیں مشتاق
ہمارے ساتھ ہے سایہ ہمارا

وابستہ ہیں اس جہان سے ہم
آئے نہیں آسمان سے ہم

دکھ درد ہے ذکر و فکر اپنا
کہتے نہیں کچھ زبان سے ہم

اس جوش نمو سے لگ رہا ہے
اترے نہیں اس کے دھیان سے ہم

کمروں میں اجنبی مکیں تھے
کچھ کہہ نہ سکے مکان سے ہم

محفل تو جمی رہے گی مشتاق
اٹھ جائیں گے درمیان سے ہم

rekhta

کبھی کبھی ہم ایسے باتیں کرتے ہیں
جیسے نیند میں بچے باتیں کرتے ہیں

جن کو کھڑے دیکھا کرتے تھے اب ان سے
رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے ہیں

دل جانے کیوں افسردہ ہو جاتا ہے
بچے جب ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہیں

آؤ سنیں پیلی آوازیں پتوں کی
دیکھو پیڑ پون سے باتیں کرتے ہیں

پھولوں کو چپ رہنے پر الزام نہ دو
اس موسم میں کانٹے باتیں کرتے ہیں

کرتے رہیں دور سے نظارے
شاید یہی بھاگ تھے ہمارے

کس دیس کی کشتیاں کھڑی ہیں
جلتی ہوئی شام کے کنارے

جنگل کے اداس جھٹپٹے میں
دریا کو پکارتے ہیں دھارے

تبدیل ہوئے ہیں جگنوؤں میں
کس آتش ہجر کے شرارے

کس صبح کی راہ دیکھتے ہیں
یہ رات یہ آسماں یہ تارے

تھمتی نہیں وقت کی صدائیں
اس شور میں دل کسے پکارے

حیرت سے جہاں کو دیکھتا ہوں
کیا روپ ہیں زندگی نے دھارے

rekhta

یوں تو در وا تھے بہت فکر و عمل کی جانب
ہم تمھیں دیکھ کے آئے تھے غزل کی جانب

ایسی دلچسپ ہوئیں دشت جنوں کی راہیں
مڑ کے دیکھا نہ کبھی باغ ازل کی جانب

جو بڑے زور سے لائے تھے خدا پر ایمان
جلد ہی لوٹ گئے لات و ہبل کی جانب

آہی جاتی تھی کبھی نعرۂ یاہو کی صدا
ہو کا عالم تو نہ تھا دشت و جبل کی جانب

آرزو ہے کہ کبھی ہاتھ پکڑ کر میرا
لے چلو تم کسی گذرے ہوئے کل کی جانب

لکھے تھے حرف ترے نام کے درختوں میں
انھیں کو ڈھونڈتے پھرتے رہے درختوں میں

ابھی جو گھاس پہ تھے ٹولیاں بنائے ہوئے
بکھر گئے وہ پرندے گھنے درختوں میں

وہ میرے خواب کی پریاں مرے خیال کے جن
چھپے ہوئے تھے عجب واہمے درختوں میں

نہ جانے کون رتوں کے بچے ہوئے بادل
تمام رات گرجتے رہے درختوں میں

نہ جانے کب کے سنے زمزموں کی آوازیں
پکارتی رہیں بھیگے ہوئے درختوں میں

ادھر بھی آئے گی شاخ نہال غم سے کہو
ہوا چلی ہے ابھی، دوسرے درختوں میں

چشم و لب کیسے ہوں رخسار ہوں کیسے تیرے
ہم خیالوں میں بناتے رہے نقشے تیرے

تیرے ساونت کو سولی کی زباں چاٹ گئی
جسم ابھی گرم تھا اور بال تھے گیلے تیرے

کیا کہوں، کیا ترے افسردہ دلوں پر گذری
کیسے تاراج ہوئے آئینہ خانے تیرے

اب کہاں دیکھنے والوں کو یقیں آئے گا
باغ جنت تھا بدن خواب تھے بوسے تیرے

rekhta

دل سے کبھی گذرا تھا آغاز جوانی میں
عکس گل داؤدی، ٹھہرے ہوئے پانی میں

یاں سیکڑوں تفسیریں اے قصۂ غم تیری
واں فرق نہیں کوئی الفاظ و معانی میں

یہ سرخ لکیریں جو دل میں نظر آتی ہیں
رستے ہیں بہاروں کے اس برگ خزانی میں

کچھ اپنے تغافل سے فرصت نہ ملی اس کو
کچھ دیر ہوئی مجھ سے اظہار زبانی میں

دم گھٹا جاتا ہے سبزے کی فراوانی سے
میں نکل جاؤں گا اس قریۂ بارانی سے

ایسی بستی سے تو اچھا ہے بیاباں اپنا
آدمی سانس تو لے سکتا ہے آسانی سے

چار سو پیش نظر صبح ازل ہو جیسے
دیکھتا رہتا ہوں ہر شکل کو حیرانی سے

rekhta

پانی میں عکس اور کسی آسماں کا ہے
یہ ناؤ کون سی ہے یہ دریا کہاں کا ہے

دیوار پر کھلے ہیں نئے موسموں کے پھول
سایہ زمین پر کسی پچھلے مکاں کا ہے

چاروں طرف ہیں سبز سلاخیں بہار کی
جن میں گھرا ہوا کوئی موسم خزاں کا ہے

سب کچھ بدل گیا ہے تہ آسماں مگر
بادل وہی ہیں رنگ وہی آسماں کا ہے

دل میں خیال شہر تمنا تھا جس جگہ
واں اب ملال اک سفر رائیگاں کا ہے

تھم گیا درد ، اجالا ہوا تنہائی میں
برق چمکی ہے کہیں رات کی گہرائی میں

باغ کا باغ لہو رنگ ہوا جاتا ہے
وقت مصروف ہے کیسی چمن آرائی میں

شہر ویران ہوئے بحر بیابان ہوئے
خاک اڑتی ہے در و دشت کی پہنائی میں

ایک لمحے میں بکھر جاتا ہے تانا بانا
اور پھر عمر گذر جاتی ہے یکجائی میں

اس تماشے میں نہیں دیکھنے والا کوئی
اس تماشے کو جو برپا ہے تماشائی میں

اب وہ گلیاں وہ مکاں یاد نہیں
کون رہتا تھا کہاں یاد نہیں

جلوۂ حسن ازل تھے وہ دیار
جن کے اب نام ونشاں یاد نہیں

کوئی اجلا سا بھلا سا گھر تھا
کس کو دیکھا تھا وہاں یاد نہیں

یاد ہے زینۂ پیچاں اس کا
درودیوار مکاں یاد نہیں

یاد ہے زمزمۂ ساز بہار
شور آواز خزاں یاد نہیں

rekhta

مونس دل کوئی نغمہ کوئی تحریر نہیں
حرف میں رس نہیں آواز میں تاثیر نہیں

آہی جاتا ہے اجڑتی ہوئی دنیا کا خیال
باور آیا کہ ترا درد ہمہ گیر نہیں

ہجر اک وقفۂ بیدار ہے دو نیندوں میں
وصل اک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں

میرے اطراف یہ زنجیر علائق کیسی
زندگی جرم سہی قابل تعزیر نہیں

کس طرح پائیں اس افسردہ مزاجی سے نجات
ہمدمو! ہم سخنو! کیا کوئی تدبیر نہیں

rekhta

رہ شوق میں کیا ہوا کون جانے
مرا حال میرے سوا کون جانے

ترے غم رسیدوں کا غم کون سمجھے
ترے گمشدوں کا پتہ کون جانے

کدھر بہ گیا سبز دریا کا پانی
کنارہ کہاں رہ گیا کون جانے

دیا جو تمنا کا جلتا تھا دل میں
کہاں گل ہوا کب ہوا کون جانے

جو میں نے کہا تھا وہ میں جانتا ہوں
کسی نے مگر کیا سنا کون جانے

جو سب پر گذرتی ہے مجھ پر بھی گذرے
برا تھا کوئی یا بھلا کون جانے

بتا رہا تھا کوئی آشنائے آبِ رواں
کہ جنتیں ہیں عجب زیرِ پائے آبِ رواں

وہی طلوعِ مسلسل ہے جس طرف دیکھو
تمام آبِ رواں ہے ورائے آبِ رواں

حواس اگرچہ نظر بندیٔ سراب میں ہیں
دلوں کو کھینچ رہی ہے صدائے آبِ رواں

جو روشنی سے بھرے تھے اب ان علاقوں میں
نہ دھوپ ہے نہ کہیں جھلملائے آبِ رواں

ترے خیال کے آتے ہی یاد آتے ہیں
شفق کے رنگ، درختوں کے سائے، آبِ رواں

ہم ہیں اب اور گھر ہمارا ہے
یہی سیر و سفر ہمارا ہے

وہ درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟
وہیں بستی میں گھر ہمارا ہے

بار بار اس گلی میں جاتے ہیں
جیسے کوئی ادھر ہمارا ہے

کیوں پریشاں کریں زمانے کو
دردِ دل دردِ سر ہمارا ہے

ہم ہیں مزدور کارخانۂ شوق
خواب سازی ہنر ہمارا ہے

دیکھئے ہوتی ہے کب نشو ونما پانی کی
ہم نے اک اشک سے ڈالی ہے بنا پانی کی

اپنی قسمت میں ہے اک دشت بلا کا منظر
اور اطراف سے آتی ہے صدا پانی کی

دست خالی کے سوا ان کے تصرف میں ہے کیا
کیا کریں لوگ جو مانگیں نہ دعا پانی کی

اس سے پہلے کہ ترس جائیں نمی کو آنکھیں
لوح دل پر کوئی تصویر بنا پانی کی

رات کچھ یوں دل پردرد سے گذری تری یاد
جیسے صحرا سے گذرتی ہے ہوا پانی کی

سوکھتا جاتا ہے دریائے محبت مشتاق
مصرع تر سے کوئی موج اٹھا پانی کی

پھر وہی آنسو وہی خاموشیاں سازوں کے بعد
نغمہ آوازوں سے پہلے ہے نہ آوازوں کے بعد

کتنے گھر باقی ہیں کتنی دستکیں باقی ہیں اور
تیرا دروازہ کھلے گا کتنے دروازوں کے بعد

جانے کس کس سے ملیں ہم تجھ سے ملنے کے لئے
پھر تری آواز آئے کتنی آوازوں کے بعد

پھر وہی ٹوٹی ہوئی شاخیں وہی پتوں کے ڈھیر
کیا ملا ان بے جہت بے درد پروازوں کے بعد

شوق ہنگامہ طلب کچھ اس کا اندازہ بھی ہے
وہ جو اک پرہول سناٹا ہے آوازوں کے بعد

(سہیل احمد خاں کے لئے)

بام و دیوار و در نہیں کوئی
کہاں جائیں کہ گھر نہیں کوئی

گم ہوئے یوں غبار ہستی میں
ہم کو اپنی خبر نہیں کوئی

رات جاتی نظر نہیں آتی
اور آگے سحر نہیں کوئی

دستکوں کی صدائیں آتی ہیں
اور بیرون در نہیں کوئی

rekhta

بجھ گیا منظر کنارۂ بام
دوستو بام پر نہیں کوئی

یوں نہ حیران ہو کے دیکھ مجھے
جیسے تجھ کو خبر نہیں کوئی

ہنرِ غم کو چشمِ کم سے نہ دیکھ
اس سے بہتر ہنر نہیں کوئی

rekhta

رات پھر رنگ پہ تھی اس کے بدن کی خوشبو
دل کی دھڑکن تھی کہ اڑتے تھے لہو میں جگنو

جیسے ہر شے ہو کسی خواب فراموش میں گم
چاند چمکا نہ کسی یاد نے بدلا پہلو

صبح کے زینۂ خاموش پہ قدموں کے گلاب
شام کی بند حویلی میں ہنسی کا جادو

صحن کے سبز اندھیرے میں دمکتے رخسار
صاف بستر کے اجالے میں چمکتے گیسو

جھلملاتے رہے وہ خواب جو پورے نہ ہوئے
درد بیدار ٹپکتا رہا آنسو آنسو

rekhta

غزل : بغداد میں صبح

وہی ان کی ستیزہ کاری ہے
وہی بے چارگی ہماری ہے

وہی ان کا تغافل پیہم
وہی اپنی گلہ گذاری ہے

وہی رخسار وچشم ولب ان کے
وہی بے چہرگی ہماری ہے

حسن ہو خیر ہو صداقت ہو
سب پہ ان کی اجارہ داری ہے

ہاتھ اٹھا توسن تخیل سے
یہ کسی اور کی سواری ہے

rekhta

دل کا بوجھ تو ہلکا ہوتا
رو لیتے تو اچھا ہوتا

یہ شب یہ گیلی تاریکی
کوئی جگنو چمکا ہوتا

rekhta

اس حسن بے اماں کی حفاظت میں ہوں کہ جو
دکھلائی بھی نہ دے نظر انداز بھی نہ ہو

اے جان دلبری وہ تمنا کہاں سے لاؤں
جس کا سراغ بھی نہ ملے راز بھی نہ ہو

rekhta

خوشی ضرور ملی لیکن اس قدر بھی نہیں
کہ بارشوں کے دنوں کے لئے بچا رکھتے

صدائے نغمۂ جاں کس طرف سے آتی ہے
یہ جانتے تو سراغ نشان پا رکھتے

کھڑے ہیں دل میں جو برگ و ثمر لگائے ہوئے
تمھارے ہاتھ کے ہیں یہ شجر لگائے ہوئے

بہت اداس ہو تم اور میں بھی بیٹھا ہوں
گئے دنوں کی کمر سے کمر لگائے ہوئے

ابھی سپاہ ستم خیمہ زن ہے چار طرف
ابھی پڑے رہو زنجیر در لگائے ہوئے

کہاں کہاں نہ گئے عالم خیال میں ہم
نظر کسی کے در و بام پر لگائے ہوئے

وہ شب کو چیر کے سورج نکال بھی لائے
ہم آج تک ہیں امید سحر لگائے ہوئے

دلوں کی آگ جلاؤ کہ ایک عمر ہوئی
صدائے نالۂ دود و شرر لگائے ہوئے

ان موسموں میں ناچتے گاتے رہیں گے ہم
ہنستے رہیں گے شور مچاتے رہیں گے ہم

لب سوکھ کیوں نہ جائیں گلا بیٹھ کیوں نہ جائے
دل میں ہیں جو سوال اٹھاتے رہیں گے ہم

اپنی رہ سلوک میں چپ رہنا منع ہے
چپ رہ گئے تو جان سے جاتے رہیں گے ہم

نکلے تو اس طرح کہ دکھائی نہیں دیئے
ڈوبے تو دیر تک نظر آتے رہیں گے ہم

دکھ کے سفر پہ دل کو روانہ تو کر دیا
اب ساری عمر ہاتھ ہلاتے رہیں گے ہم

گردش میں پیمانے آئے
مست الست زمانے آئے

پھول تھے یا شمعیں روشن تھیں؟
اڑ اڑ کر پروانے آئے

جنگل دھڑ دھڑ جلتا تھا
دریا پیاس بجھانے آئے

اپنے دیوانوں سے ملنے
شہروں میں ویرانے آئے

ہم بھی اس برباد جہاں میں
تھوڑی خاک اڑانے آئے

میں بے وجہ روتا رہا رات بھر
بھرے زخم دھوتا رہا رات بھر

سر بزم دل حسرتیں جمع تھیں
ترا ذکر ہوتا رہا رات بھر

برستا رہا وقفے وقفے سے مینھ
دریچے بھگوتا رہا رات بھر

بھری ٹہنیوں سے، ہواؤں کا شور
گلے لگ کے روتا رہا رات بھر

چمکتی رہیں رات بھر بجلیاں
اجالا سا ہوتا رہا رات بھر

rekhta

جب پرندے پس دیوار خزاں بولتے ہیں
دل میں نادیدہ بہاروں کے نشاں بولتے ہیں

سرخی شام الم گیت میں ڈھل جاتی ہے
زخمۂ درد سے تار رگ جاں بولتے ہیں

کیا لکھا ہے ترے قانون طرب میں اے دوست
اپنے اطراف تو نغمے کو فغاں بولتے ہیں

جاگتا ہوں تو صدا دیتی ہیں قاتل یادیں
سونے لگتا ہوں تو زخموں کے نشاں بولتے ہیں

حسرتیں چپ ہیں مگر تیز ہے دل کی دھڑکن
جب مکیں مہر بلب ہوں تو مکاں بولتے ہیں

rekhta

ملال دل سے علاج غم زمانہ کیا
ضیائے مہر سے روشن چراغ خانہ کیا

سحر ہوئی تو وہ آئے لٹوں کو چھٹکاتے
ذرا خیال پریشانی صبا نہ کیا

ہزار شکر کہ ہم مصلحت شناس نہ تھے
کہ ہم نے جس سے کیا عشق، والہانہ کیا

وہ جس کے لطف میں بیگانگی بھی شامل تھی
اسی نے آج گذر دل سے محرمانہ کیا

وہ بزم حرف ہو یا محفل سماع خیال
جہاں بھی وجد کیا ہم نے بے ترانہ کیا

rekhta

یہ کون خواب میں چھو کر چلا گیا مرے لب
پکارتا ہوں تو دیتے نہیں صدا مرے لب

یہ اور بات کسی کے لبوں تلک نہ گئے
مگر قریب سے گذرے ہیں بارہا مرے لب

اب اس کی شکل بھی مشکل سے یاد آتی ہے
وہ جس کے نام سے ہوتے نہ تھے جدا مرے لب

اب ایک عمر سے گفت و شنید بھی تو نہیں
ہیں بے نصیب مرے کان بے نوا مرے لب

یہ شاخسانۂ وہم و گمان تھا شاید
کجا وہ ثمرۂ باغ طلب کجا مرے لب

rekhta

چمک دمک پہ نہ جاؤ کھری نہیں کوئی شے
سوائے شاخِ تمنا ہری نہیں کوئی شے

دل گداز و لبِ خشک و چشمِ تر کے بغیر
یہ علم و فضل یہ دانش وری نہیں کوئی شے

تو پھر یہ کشمکشِ دل کہاں سے آئی ہے
جو دل گرفتگی و دلبری نہیں کوئی شے

عجب ہیں وہ رخ و گیسو کہ سامنے جن کے
یہ صبح و شام کی جادوگری نہیں کوئی شے

rekhta

ملال سایۂ دیوار یار کے آگے
شب طرب تری نیلم پری نہیں کوئی شے

جہان عشق سے ہم سرسری نہیں گذرے
یہ وہ جہاں ہے جہاں سرسری نہیں کوئی شے

تری نظر کی گلابی ہے شیشۂ دل میں
کہ ہم نے اور تو اس میں بھری نہیں کوئی شے

اب منزلِ صدا سے سفر کر رہے ہیں ہم
یعنی دلِ سکوت میں گھر کر رہے ہیں ہم

کھویا ہے کچھ ضرور جو اس کی تلاش میں
ہر چیز کو ادھر سے ادھر کر رہے ہیں ہم

گویا زمین کم تھی تگ و تاز کے لئے
پیمائشِ نجوم و قمر کر رہے ہیں ہم

کافی نہ تھا جمالِ رخِ سادۂ بہار
زیبائشِ گیاہ و شجر کر رہے ہیں ہم

اس روے صاف و زلف پریشاں کو کیا خبر
کن الجھنوں میں شام و سحر کر رہے ہیں ہم

آنکھیں چرائیں درد جہاں سے کہاں تلک
حتی الوسع تو صرف نظر کر رہے ہیں ہم

rekhta

مجھے اس نے تری خبر دی ہے
جس نے ہر شام کو سحر دی ہے

گم رہا ہوں ترے خیالوں میں
تجھ کو آواز عمر بھر دی ہے

دن تھا اور گرد رہگذار نصیب
رات ہے اور ستارہ گردی ہے

سرد و گرم زمانہ دیکھ لیا
نہ وہ گرمی ہے اب نہ سردی ہے

rekhta

کیا جہاں میں ہے جو نہیں دل میں
دل نوردی جہاں نوردی ہے

دل غمیں ہے کہ تیری یاد نے کیوں
آج آنے میں دیر کر دی ہے

rekhta

اشعار

رات باقی نہ چراغ رخ زیبا باقی
وہ زماں ہو کہ مکاں کچھ نہیں رہتا باقی

یہ دھواں سا نظر آتا ہے جو پیڑ
شعلۂ رنگ خزاں تھا پہلے

محبت میں زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا
زیادہ سوچنے سے وسوسے گھر دیکھ لیتے ہیں

کل جس کا تصور ہی نشاط دل و جاں تھا
آج اس سے ملاقات بھی اچھی نہیں لگتی

دیکھیں کیا گذرے ہم ایسے سوختہ جانوں کے ساتھ
جو نہ دیوانوں میں شامل ہیں نہ فرزانوں کے ساتھ

پانی میں کانپتے ہیں ابھی تک پلوں کے عکس
وہ سیل بے پناہ تو کب کا گذر گیا

---

rekhta

ہم نے بھی ایک دریچے کو مہتاب میں ڈھلتے دیکھا ہے
اے عشق کبھی ہم بھی تیری جادو نگری میں رہتے تھے

پریوں کی تلاش میں گیا تھا
لوٹا نہیں آدمی ہمارا

تمام شد کلیات احمد مشتاق بعونہٖ تعالیٰ
در شہر الٰہ آباد باہتمام شب خون کتاب گھر طبع گردید
مارچ ۲۰۰۴